نظیر حسنین زیدی
ایم۔ اے

غالب تاریخ کے آئینے میں

اور

دوسرے مضامین

سید نظیر حسنین زیدی
گورنمنٹ کالج۔ سکھر

مسعود اکادمی ڈی ۲/۲۳ مسعود منزل ناظم آباد ۲ کراچی

سال اشاعت اگست ۶۳ء

اشاعت ــــــ ایک ہزار
کتابت ــــــ محمد ایوب۔ سکھر
طباعت ــــــ اتحاد پریس۔ سکھر
سرورق کتابت ــــــ فیض الکتابت۔ کراچی
سرورق طباعت ــــــ الفاروق پریس کراچی

ــــــ ★ ــــــ

طابع وناشر ــــــ محمد مسعود الحسنین

قیمت تین ۳ روپے صرف

اِنتسابُ

لائق صد احترام استاذی المعظم
پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفےٰ صاحب
ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ ڈی۔ لٹ
صدر، شعبۂ اردو، سندھ یونیورسٹی (حیدرآباد)

کے نام

جن کے قدموں کی خاک میرے لئے سرمۂ بینش ہے۔ ع
آناں کہ خاک را بنظر کیمیا کنند

نظیر حسنین سیّد

نام ــــــــ سید منظر حسنین زیدی

پیدائش ــــــــ اپریل ۱۹۲۳ء

وطن ــــــــ برست نزد پانی پت

تعلیم ــــــــ ایم اے (اردو، فارسی)

مولوی فاضل (پنجاب)

مشاغل ــــــــ درس و تدریس، تصنیف و تالیف

لیکچرر گورنمنٹ کالج سکھر

تالیفات ــــــــ (۱) انقلاب ایران زیر طبع

(۲) اقبال ضرب کلیم کی روشنی میں

(۳) تین جدید شعراء (امجد، فیض، ندیم) زیر ترتیب

(۴) اردو کا صحافتی ادب "

مندرجات

گذارشِ احوال

بعض باتیں کہنے کی ہوتی ہیں اور لکھنے کی نہیں، بعض لکھنے کی ہوتی ہیں اور
کہنے کی، بعض نہ لکھی جا سکتی ہیں اور نہ کہی جا سکتی ہیں۔ لیکن جذبۂ دل کہتا ہے کہ اگر
کہی نہیں جا سکتی ہیں تو لکھی ضرور جانی چاہئیں۔ غالباً دل کا یہ جبر کسی تاثر سے
شدید طور پر متاثر ہونے کا نتیجہ ہے۔

میرے خیال میں ان تاثرات کی بنا پر ہی ہمارے مطالعہ کی بنیاد رکھی جاتی
ہے۔ اور یہیں سے ہمارے ذوق کی گویا ابتدا ہوتی ہے۔ اور ادب کی دنیا میں
انسان کا ذوق کسی ادیب، مصنف یا شاعر کی نظم یا نثر سے متاثر ہو کر اپنی
صلاحیتوں کو اجاگر کرتا ہے۔ بشرطیکہ کسی استاد کی صحیح رہنمائی بھی حاصل

ہو جائے۔ یہی خضرِ راہ اُس کو صحیح راستے پر ڈال دیتا ہے۔ جس راستے پر
چل کر انسان اپنی کاوشوں کو قلم کے حدود میں لے آتا ہے۔ اس طرح اس کو اپنی
کوتاہیوں کا پتہ بھی چلتا ہے اور کوششوں کے نتیجہ کا بھی۔

اردو ادب کا ذوق صرف استاذی المعظم ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب
کی مشفقانہ رہنمائی کے سبب حاصل ہوا۔ اور ان کی پدرانہ ہمت افزائی نے
مجھے یہ جرأت دلائی کہ میں اپنے چند مضامین کو مجموعہ میں شامل کر کے پیش
کر رہا ہوں۔

زیرِ نظر کتاب چند مضامین کا مجموعہ ہے۔ جن میں سے بعض مشفقی سید
الطاف علی صاحب بریلوی مدیرِ "العلم" کے سبب "العلم" میں شائع ہو چکے
ہیں۔ جن کے لئے میں ان کا ازحد ممنون ہوں۔

غالب کے ایک دوست نواب حامد علی خاں رئیس تھے۔ غالب نے اپنے
خطوط میں ان کا کئی جگہ تذکرہ کیا ہے۔ ایک مضمون میں ان کے تعلقات پر روشنی
ڈالی گئی ہے۔ اور دوسرے مضمون میں غالب کی سوانح حیات کو تاریخی لحاظ سے جمع
کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اردو میں مکتوب نویسی نے ایک اہم حیثیت اختیار کر لی ہے۔ ایک مضمون میں
اہم شخصیتوں پر تاثرات ہیں جن کی تحریروں سے متاثر ہوا۔ اور ان کی تحریروں
کا ہر ہر لفظ میرے لئے ادب کا ایک ایسا خزانہ ہے جس کی قیمت طے کی

نہیں جا سکتی ہے اور نیاز کے خطوط کا تو ہر ہر فقرہ اردو ادب کی گویا جان ہے۔ اس
کے علاوہ ایک مضمون پر انیسویں صدی کے ایک اہم اخبار رفیقِ ہند کا ذکر ہے جس کی
صحافتی دیانت اور بے باک تحریر نے شمالی ہند میں اربابِ فہم سے خراجِ تحسین
لیا تھا۔

غالبیات کے سلسلے میں شیخ محمد اکرام۔ آل احمد سرور۔ مولانا غلام رسول مہر۔ مولانا
امتیاز علی عرشی۔ مالک رام۔ ڈاکٹر ممتاز الدین آرزو۔ اور ڈاکٹر شوکت سبزواری کی
کتابوں سے میں نے جس قدر استفادہ کیا، اس کے اظہار کے لئے میرے پاس مناسب
الفاظ موجود نہیں۔ یہ سب حضرات ہمارے ادب میں ممتاز ترین اہمیت کے مالک ہیں۔
اور ان کی تحریریں ہمارے لئے باعثِ افتخار ہیں۔ اس کے علاوہ نادراتِ غالب
مؤلف آفاق صاحب کی تالیف سے غالب کے سلسلے میں نئی معلومات حاصل ہوئیں
میں ان سب حضرات کا ممنون ہوں۔

کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں عزیزی رحمت اللہ قریشی بی اے خاص طور
پر دعاؤں کے مستحق ہیں جنہوں نے کاتب سے لیکر طباعت تک کی تمام منزلوں کو اپنے
قیمتی وقت سے سر کیا۔ ورنہ اس کا شائع ہونا تقریباً ناممکن تھا۔

بہر حال اپنی کوتاہیوں کے اعتراف کے ساتھ اربابِ فہم و نظر کی مشفقانہ رہنمائی
کا محتاج ہوں۔

نظر حسنین زیدی
گورنمنٹ کالج سکھر

سکھر۔ ۱۴ر اگست ۶۳ء

گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

غالب اور نواب حامد علی خاں

یوں تو غالب کی زندگی میں حزن و یاس کے باوجود ایک ایسا سکون، شیوۂ تسلیم و رضا
پایا جاتا تھا کہ جس نے اپنے ماحول پر نہیں لیکن بعد میں آنے والے ماحول پر یقیناً اچھا اثر
ڈالا۔ مصیبتوں کے باوجود وہ دوسروں کو صبر کی تلقین کرتے رہے اور ہم تکالیف کے
احساس کے ساتھ ساتھ وہ مسکرا مسکرا کر وقت گزارتے رہے۔ شکایات بھی کیں تو نئے انداز
میں۔ تکلفات، وضع داری کے باعث چاہے اُن کی زندگی میں کتنی ہی الجھنیں سامنے آئیں
لیکن وہ ان سے نکلنے کی سعی کرتے رہے اور یہی کہا کئے کس کے گھر آئیگا سیلابِ فنا میرے بعد
اپنے غموں کو بھول کر دوسروں کے غموں کو کم کرنے کی فکر کرنا یہی وہ فلسفۂ
حیات ہے جس نے غالب کو حیاتِ جاوداں بخشی۔ خود تو نیرنگیٔ قدرت کا تماشا دیکھا
کئے دنیا کے دامِ خیال میں آ الجھے سے دوسروں کو یہ کہہ کر بہلاتے رہے ع

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسد

لیکن غدر کے پُر آشوب ہنگام نے اُن کے دل و دماغ پر جو اثر کیا ہے۔
قتل و غارت، لوٹ مار، جس میں داد نہ فریاد، انہدامِ مکانات اور دار و گیر نے ان کو
اس قدر آٹھ آٹھ آنسو رلایا ہے کہ وہ خود کہے بغیر نہ رہ سکے ؎

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی　　اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

اسی لئے وہ خطوط اردو میں شہ پارے کی حیثیت رکھتے ہیں جس میں غدر کا تذکرہ انہوں نے دلنشین انداز میں کیا ہے۔ اس غمِ روزگار میں اپنے غم کو بھول گئے۔ دوسروں کے غم نے انہیں اس قدر متاثر کیا کہ اس کا اظہار کئے بغیر نہ رہ سکے۔ انہیں شخصیتوں میں ایک قابلِ قدر شخصیت نواب حامد علی خان کی تھی۔ اگرچہ بہادر شاہ ظفر کی سلطنت کیا اور حکومت کیا۔ لیکن اس دور میں جس قدر بچی ہوئی شخصیتیں قلعہ میں جمع ہو گئی تھیں وہ بھی اپنے دور میں بسا غنیمت تھیں۔ بلکہ بقول رشید احمد صدیقی اس دور میں ایسے افراد کا اجتماع ہو گیا تھا جو اس سے قبل اس ممتاز حیثیت سے نہیں ملتا۔

بہادر شاہ ظفر کی درویشانہ طبیعت جو دنیا کے سیاسی جوڑ توڑ سے پہلے ہی متنفر تھی اپنے گرد ایسے مجمع کو ہی پسند کرتی تھی جو خاموشی اور سکون سے اپنے باقی وقت کو گزار دیں۔ ایسے لوگوں کی وفاداری، ہمدردی و محبت، ہمہ گیر اخلاق و کرم پھر بھی اس قدر تھی کہ جس سے ایک عالم کو فیض پہونچتا تھا۔ ان لوگوں میں "رکھ رکھاؤ"، وضع کی پابندی احسانی تعلقات وسیع کرنے کا جذبہ کم از کم موجودہ زمانہ کے لوگوں سے ہزاروں درجہ کہیں زیادہ موجود تھا۔

میرے خیال میں یہی وہ چیز تھی جسے غالب نے اپنے خطوط کے آئینہ میں پیش کیا۔ اور اسی چیز کے مٹنے نے انھیں اضطرابِ مسلسل میں رکھا۔

"یہاں کا یہ حال ہے کہ مسلمان امیروں میں تین آدمی نواب حسن علی خان، نواب حامد علی خان، حکیم احسن اللہ خان۔ سو اُن کا حال یہ ہے کہ روٹی ہے تو کپڑا نہیں۔ یہاں کی اقامت میں تذبذب، خدا جانے کہاں جائیں کہاں رہیں۔"

(اردوئے معلیٰ ص ۳۴۸ بنام شیو نرائن)

دوسرے خط میں لکھتے ہیں۔

"نواب حامد علی خان کے مکانات سب ضبط ہو گئے وہ قاضی کے حوض پر کرایہ کے مکان میں رہتے ہیں۔ باہر جانے کا حکم نہیں ملا۔ مرزا الٰہی بخش کو حکم کراچی بندر جانے کا نہیں ہے۔"

مندرجہ ذیل سطور میں نواب حامد خاں کے متعلق ہم کچھ روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔

نواب صاحب برست (پانی پت کے قریب سادات کی بستی) کے رہنے والے تھے۔ یہ پرانی بستی ہے۔ سلطان محمود کے زمانے میں اس بستی کے مورثِ اعلیٰ ملتان آئے اور یہیں بس گئے۔ پہلے یہ خاندان ریاست پٹیالہ میں رہا۔ اس کے بعد کچھ نسلیں مظفر نگر کے علاقہ میں منتقل ہو گئیں اس ضلع میں سادات بارہہ کی بنیاد پڑی۔ اس کے بعد دو شاخیں ہو گئیں۔ ایک شاخ موضع سرسی ضلع مرادآباد میں آباد ہوئی۔ دوسری شاخ برست میں۔ تاریخی قرائن کے اعتبار سے یہ بستی ۶۰۰ سال کی آباد شدہ ہے۔

بہر حال نواب حامد علی خان یہیں کے باشندے اور نواب فضل علی خاں وزیر اودھ سلطنت کے بھانجے اور داماد تھے۔ انہی کے باعث حامد علی کو یہ عروج نصیب ہوا۔ ضمنی طور پر یہ واقعہ بھی بیان کرنے کے قابل ہے کہ نواب فضل علی خاں کس طرح وزیر ہوئے؟ ان کے والد غازی الدین حیدر کے عہد میں نگہبان تھے اور یہ عہدہ اس لئے ملا تھا کہ وہ سید تھے۔ بادشاہ کی جب سواری نکلتی تو یہ عبادت کی طرف پشت کر کے بادشاہ کے روبرو بیٹھتے تھے تاکہ یہ بے ادبی نہ ہو کہ عبادت کی پیٹھ بادشاہ کی طرف ہو۔ لہٰذا سید کو بادشاہ و عبادت کے درمیان بطور نگہبان بٹھایا جاتا تھا۔ نواب

غازی الدین حیدر کے انتقال کے بعد نواب نصیر الدین حیدر بادشاہ ہوئے اور اُن کی والدہ مغلانی اور استانی تھیں۔ نواب نصیر الدین حیدر اپنی والدہ کا بہت پاسِ ادب کرتے تھے، ہر روز صبح سلام کو آتے۔ اسی دوران میں آغا میر برطرف ہوئے۔ ایک دن نواب جو سلام کو حاضر ہوئے تو والدہ نے پریشان و مضطرب پایا۔ جب انہوں نے دریافت کیا تو کہا کہ قلمدانِ وزارت کس کے سپرد کروں۔ مشورہ دیجئے۔ والدہ نے فضل علی کی سفارش کی۔ نواب نے کہا وہ تو اس ذمہ داریوں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ والدہ نے کہا وہ کائستھ جو نائب وزیر ہے اس عرصہ میں منتظم اعلیٰ بھی رہے اور انھیں امور سلطنت کی تعلیم بھی دے۔ اس طرح ان کی تعلیم و تربیت محل میں ہوئی اور ۱۸۲۸ء میں فضل علی نائب السلطنت بنے۔ ان کی بہن کی شادی برست میں ہوئی۔ جس سے حامد علی تھے۔ یہ خبر رفتہ رفتہ ان کی بہن تک پہونچ گئی۔ حامد علی خان کے والد اپنے وطن میں کھیتی کرتے تھے۔ ایک دن دوپہر ان کو کھانا لینے کے لئے بھیجا گیا۔ یہ دیر میں پہونچے لہٰذا والد سخت ناراض ہوئے۔ یہ غصہ میں آکر چل دیئے اور لکھنؤ کا رُخ کیا۔ مصیبت بھرتے، خاک پھانکتے، لکھنؤ پہونچے۔ غربت کی گرد منہ پر پڑی ہوئی، پھٹے کپڑے، بُرا حال۔ ماموں تک رسائی ہو تو کیونکر ہو۔ ایک دن فضل علی کی سواری گذری، حامد علی نے گھور گھور کر دیکھنا شروع کیا۔ چوبدار کو اشارہ ہوا وہ حامد علی کے قریب گیا، پوچھا تو معلوم ہوا کہ برست کے رہنے والے ہیں۔ چوبدار نے جا کر عرض کی۔ نواب صاحب نے اپنے بھانجے کو بڑی مشکل سے پہچانا۔ حکم دیا کہ محل میں پہونچا دیا جائے

ایک دن دورانِ گفتگو نواب صاحب نے کہا کہ "میں برست والوں کو ٹھیک کر دوں گا۔"

بستی کے بہت سے آدمی جو لکھنؤ میں تھے گھبرا گئے کہ اب بلا ہمارے سر پر آئے گی۔ چنانچہ ایک روز دعوت نواب صاحب کی طرف سے دی گئی۔ دعوت کے بعد کہا آپ سب میرے عزیز ہیں جو تکلیف آپ کو ہو آپ سب بلا تکلف کہدیں۔ میں خدمت کے لئے حاضر ہوں۔ اہلِ وطن نے جب نواب صاحب کا یہ اخلاق دیکھا تو پاؤں پر گر پڑے۔

۱۸۲۶ء سے ۱۸۳۱ء تک نواب حامد علی خان کی تعلیم و تربیت ماموں کی سرپرستی میں ہوئی۔ ماموں نے اپنی لڑکی کی شادی ان سے کردی جس کا نام حاجی بیگم تھا۔

۱۸۳۱ء میں نواب فضل علی نے انتقال کیا۔ کسی ظریف نے مصرعۂ تاریخ کہا۔

"دھت دھت بری" حاجی بیگم (دختر نواب فضل علی) کو باپ کے انتقال کے بعد ترکہ میں نو لاکھ روپیہ ملا۔ بعد میں یہ روپیہ خزانہ شاہی میں جمع کرا دیا جس کا سود ساڑھے چار ہزار روپے ملتا تھا۔ خسر کے انتقال کے بعد نواب حامد علی خان نے دھسلی میں آکر قیام کیا۔

۱۸۲۲ء (مطابق ۱۲۳۸ھ) میں نواب حامد علی خان نے اپنے وطن میں عزاخانہ (امام باڑہ) تعمیر کیا۔ اس کی تعمیر کے لئے خصوصی انتظامات کئے گئے۔ اب تک یہ عمارت بانی تعمیر کی ذوقِ تعمیر کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔

یہ تو تفصیل سے معلوم نہ ہو سکا کہ مرزا غالب سے مراسم کس طرح قائم ہوئے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ مراسم رفتہ رفتہ گہرے ہوتے گئے جس کا اثر مرزا کے خطوط سے ظاہر ہے۔

مرزا غالب کی شاعری کا یہ دور فارسی شاعری کا تھا۔ اسی لئے امام باڑہ مذکور کے لئے بھی قطعہ تاریخ فارسی میں کہا۔

گلی زگلبنِ حیدر شگفت در عالم — بباغ آلِ نبی حامد علی بسنجا
بابر فیضِ دل سنگ را نماید آب — بلطف بلبلِ تصویر را کند گویا
بنا نمود چون قصر پی عزائی حسین — ز بہر رواق بلند است نالۂ زہرا
چون آہ داشت ستونش گرم محراب — دہد بیاد بلال در محرم را
برائے سال بنائیش بگریہ ہاتف گفت — مکان ماتم آلِ عبا متین بنا

(۱۲۴۸ھ)

یہی وہ دور تھا جب مرزا کلکتے سے واپس آچکے تھے اور مقدمہ پنشن کا فیصلہ ان کے خلاف ہو گیا تھا۔ مرزا کی توجہ زیادہ تر فارسی ادب کی طرف منعطف ہو گئی تھی۔ اور اب وہ تمام چیزوں سے مایوس ہو کر گھر میں بیٹھ رہے تھے۔

چھ سال کے بعد نواب صاحب نے کشمیری دروازے کے باہر مسجد کی تعمیر کی اور مرزا غالب نے اس مسجد کی بھی تاریخِ تعمیر کہی ؎

اعتماد الدولہ کز افراطِ جود — ہست در پیش کفش قلزم غدیر
دیدہ ور حامد علی کز دو صفا — بیند اسرارِ ازل را در ضمیر
ساخت در دہلی ہمایوں مسجدے — تا شود طاعت گہِ برنا و پیر
غالب آن طوطی نشیمن عندلیب — زد باندازِ سخن سنجی صفیر
شد نظیر کعبہ در عالم پذیر — سال تعمیرش بود کعبہ نظیر

سنہ ۱۲۵۷ھ (۱۸۴۱ء)

مرزا صاحب کبھی کبھی اس مسجد میں جاتے تھے جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں۔

"ہر صبح کو حامد علی کی مسجد میں قرآن جا کر سنتا ہوں۔ شب کو مسجد میں تراویح پڑھتا ہوں۔ کبھی جو جی میں آجاتی ہے تو وقتِ صوم مہتاب باغ میں جا کر روزہ کھولتا ہوں اور سرد پانی پیتا ہوں۔" (غالب نمبر علیگڑھ میگزین)

اعتماد الدولہ نواب فضل علی خان کو جو محبت دہلی سے تھی اس کا نتیجہ عربک کالج کی شکل میں آج تک موجود ہے۔

اعتماد الدولہ نے جب روپیہ سرکار انگریزی میں داخل کیا تو وقف نامہ میں منجملہ دیگر باتوں کے یہ الفاظ بھی تھے اگر گورنمنٹ اس روپیہ کے صحیح مصرف میں عدم توجہی کا اظہار کرے تو میرے بھانجے اور داماد نواب حامد علی خان گورنمنٹ کو اس طرف متوجہ کرتے رہیں گے۔

سنا ہے حامد علی تقریباً نو مہینے بہادر شاہ کے وزیر بھی رہے۔ مگر اس امر کی تصدیق نہیں ہو سکی۔ بہر حال غدر کا ایک واقعہ یوں مشہور ہے کہ نواب حامد علی نے پہلے جنرل چھاؤنی کی بیٹی اور صاحب انگریز کی بیوی کو اپنے گھر میں چھپا رکھا تھا۔ باغی فوج یہ سن کر دوڑی ہوئی آئی، گھر لوٹ لیا اور انہیں جان سے مارنا چاہتی تھی کہ مرزا ابوبکر شہزادہ جا پہنچے۔ اس طرح ان کی جان بچی اور انھیں کہیں اور بھیج دیا۔

یہ اخبار ہر روزہ دربار شاہی اپنے بھتیجے فرزند علی کے ہاتھ مولوی رجب علی ارسطو جاہ مہتمم اخبار سرکار کے پاس بھیجتے تھے تا کہ ہڈسن صاحب جنرل افواج کو اطلاعات بہم پہنچتی رہیں اور اپنے وطن قدیم سے خط وغیرہ حسب ضرورت معاصرین سرکار کو بھیجا کرتے تھے جب فوج سرکار شہر میں داخل ہوئی، ایک روز چپکے شہر سے نکل کر پہاڑ خانہ میں جا ٹھہرے۔ بعد ازاں سرکار انگریزی ہڈسن صاحب کے

کے بلانے پر اُن کے پاس پہنچے۔ ان کی خدمت میں ایک لاکھ روپے پیش کئے اور ان سے اجازت لے کر اپنے عیال کو برست روانہ کیا۔ وہ اشخاص جو باغیوں کے شریک تھے ان کی اجازت سے قافلے میں شریک ہوتے جاتے تھے۔ سینکڑوں آدمیوں کو زادِ راہ، سفر خرچ و سواری سے مدد کی۔ یہ قافلہ دس ہزار کے قریب پہنچ گیا۔ ان کے عیال برست رہے۔ باقی لوگ متفرق ہو گئے۔ تین چار دن بعد مولوی رجب علی ارسطو جاہ (ساکن جگراؤں ضلع لدھیانہ) کے ساتھ نواب صاحب تشریف لائے اور مولوی صاحب واپس کرنال چلے گئے۔

۱۹ صفر ۱۲۷۴ھ (۱۸۵۷ء) قبل از نماز صبح رچرڈ کلکٹر کرنال مع دو سو سوار کے آئے۔ نواب صاحب کا گھر گھیر لیا۔ تقریباً ۹ لاکھ کا سب اسباب و دولت لوٹ لیا۔ یہاں تک کہ سروں پر چادر بھی نہ رہی۔ چنانچہ ایک باغی شخص کے پاس سے جو اسی لوٹ میں شریک تھا پانی پت میں ایک مالا مروارید ایک گھنٹہ نکلا جس کی قیمت کا اندازہ ۸۰ ہزار روپیہ ہوا۔

اس کے بعد حامد علی خان، میر عباس میرزا، محمد وزیر مرزا، اور ۲۲ ملازمین کو قید کر کے پیادہ کرنال لے گئے وہاں سے شکرم پر سوار کر کے دہلی بھیج دیا۔ باقی عورات کو زندان وطن میں رہنے دیا۔ مُحسن صاحب جو نواب حامد علی خان کے مددگار تھے وہ حضرت گنج لکھنؤ میں مارے گئے۔ یہ وسیلہ ظاہری بھی ختم ہو گیا، غرض غدر کے بعد ۱۴ ماہ تک حوالات میں رہے، فروری ۵۹ء میں رہا ہوتے۔"

مندرجہ ذیل سطور قیصر التواریخ کی ہیں، جن سے ایک طرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حامد علی خان انگریزوں سے مل گئے۔ دوسری طرف یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ کلکٹر کرنال نے

ان کو قید کر کے دہلی واپس بھیج دیا۔ دونوں چیزوں میں تضاد ہے۔

اگر باغیوں میں شمار تھا تو حامد علی خان نے اس قدر روپیہ انگریزوں کو دیا۔ باطمینان تمام وطن آئے، انگریزوں کے ساتھ تھے تو قید کیوں ہوئے اور ان کی تمام جائداد سکنی جو کاٹھ کے پلے سے لیکر ڈفرن برج تک تھی وہ سب ضبط ہو گئی۔

یہ مشہور ہے کہ نواب صاحب کی رہائی کے لئے مولوی رجب علی صاحب ارسطو جاہ اور خلیفہ محمد حسن صاحب نے بہت کوششیں کیں اور انہی کے باعث وہ رہا ہوئے۔ بستی کے بزرگوں سے سنا گیا ہے کہ امام باڑہ کا تمام قیمتی سامان فانوس وغیرہ مولوی رجب علی صاحب نے پوری کوششوں سے واپس لیا اور ان کی رہائی کے بعد خط لکھا کہ آپ کا یہ سامان میرے پاس امانتاً موجود ہے۔ چونکہ حامد علی خان ممنون تھے لہٰذا انہیں بخوشی اجازت دی کہ آپ یہ سامان اپنے وطن کے امام باڑہ میں رکھ لیں۔ اس طرح یہ تمام سامان ۱۹۴۷ء کے ہنگامے تک جگراؤں رہا۔

غرض ان کا آخری وقت بہت تکلیفوں سے گزرا۔ غالب نے اپنے خط میں مرقومہ ۱۸۵۹ء میں لکھا ہے، یہ خط معین الدولہ ذوالفقار الدین حیدر معروف بہ حیدر مرزا کے نام تھا۔

"صاحب! تم نے غلط لکھا ہے۔ نہ حسن علی خان مقید نہ حامد علی خان نہ حکیم احسن اللہ خان۔ حکیم آخر تنخواہوں کے لئے نہیں ملا تھا۔ حکیم احسن اللہ کے مکانات پر ان کو قبضہ مل گیا۔ زنانہ مکان جو عقب حمام ہے اس میں ایک انگریز اترا ہوا ہے بلکہ ان کو ۲۵ روپے کرایہ دیتا ہے۔ دیبی سنگھ سالگ رام کو ان کے مکانات مل گئے

ایسا بھی سنا ہے کہ اُن کے دفینے بچ گئے۔ اب وہ حامد علی خان کو قطب الدین سوداگر
کی کوٹھی سے اُٹھا کر اپنے مکان میں لے گئے۔

نواب حامد علی خان کے کوئی اولادِ نرینہ نہیں تھی۔ صرف اولادِ دختری ہی تھی۔
جس کی شادی انہوں نے اپنے بھانجے اسد علی خان متین سے کی تھی۔ (جو ایک مشہور
شاعر تھے اور جن کے نوحے اپنی پاکیزگیٔ بیان اور رقت آمیزی کے لحاظ سے آج تک
مشہور ہیں)

نواب صاحب اپنے عادات و خصائل کے اعتبار سے بامروت آدمی تھے جھک
کر ملنا ان کی عادات میں داخل تھا۔ جب بھی وہ کبھی بر ست اپنے وطن میں آتے تو
اس کی حد میں داخل ہوتے ہی ہاتھی سے اُتر پڑتے اور بستی میں پیدل داخل ہوتے۔
لوگوں نے اس کی وجہ دریافت کی تو کہا مجھے یہ دیکھ کر شرم آتی ہے کہ میں ہاتھی پر
سوار ہو کر جاؤں جبکہ میرے اہلِ وطن کے پاس یہ سواری نہیں ہے۔

ایک اور واقعہ ان کے متعلق سنا گیا ہے کہ انہوں نے دہلی میں کوئی تقریب کی۔ اس
کے بعد وطن آئے اور اہلِ وطن کی دعوت بھی اسی تقریب کے سلسلہ میں کی۔ کیا
چھوٹے کیا بڑے سب شریک ہوئے۔ لیکن ایک سیّد صاحب جو نواب صاحب سے
خفا تھے وہ شریک نہ ہوئے۔ نواب صاحب نے چاروں طرف اپنے آدمی دوڑائے
بڑی مشکل سے پتہ چلا، لوگوں نے لاکھ کوشش کی کہ شریک ہو جائیں لیکن وہ نہ آئے۔ آخر
نواب صاحب کو خود جانا پڑا اور منا کر لائے۔ اور ان کو بھی شریکِ طعام کیا۔
نواب صاحب کا انتقال دہلی میں ہوا۔ بیرون شہر حیدر باغ میں دفن ہوئے

حصہ دہلی کے ریلوے اسٹیشن میں شامل ہو گیا ہے۔

(حوالہ جات)

(غالب از مہر۔ درہ بارہ غیر مطبوعہ نوشتہ ۱۳۰۱ھ اردوئے معلّٰی،
قیصر التواریخ)

اسمٰعیل میرٹھیؒ کے جدید رجحانات

حالی و آزاد نے اردو شاعری میں طرزِ نو کی ابتدا پنجاب میں کی اور ہمارے
ادب کی بنیاد رکھی جس میں مناظرِ قدرت اور نیچرل شاعری پر زیادہ توجہ دی گئی۔ ا
شاعری کے ذریعہ انہوں نے غزل کے اس روایتی انداز کو ختم کرنا چاہا جو جام و
کنگھی و چوٹی کے ذکر سے معمور تھا۔ اور جو افسردگی و پژمردگی کے اثرات دل پر
جاتی تھی۔ اس وقت بھی غزل میں آفاقی وسعت کا وجود تھا تو سہی لیکن بہت کم
حال اس اندازِ سخن نے لوگوں کو پست ہمتی کی طرف مائل کر دیا تھا اور وہ ہر چیز تق
کے سپرد کر کے خود گوشۂ عافیت میں بیٹھ جاتے۔ اس میں شک نہیں کہ زندہ دلانِ
پنجاب نے بہت ہمت سے کام لیا، اور پیش قدمی کی۔ انہوں نے اس نئے اد
کے ترقی دینے میں پوری ہمت کو صرف کر دیا۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ان دیگر حضرا
کے متعلق ہمیں پوری تفصیلات نہیں ملیں جنہوں نے اپنے عزیز وقت کو اس کار
خدمت کے لئے صرف کیا۔ لیکن یہ مسلمہ بات ہے کہ اس دورِ اوّل کے بعد سر شیخ
عبدالقادر ہی وہ بزرگ ہیں جنہوں نے اپنی ادبی دلچسپیوں سے اس خدمت میں
لے کر اردو ادب میں ایک ممتاز درجہ حاصل کر لیا۔ یہ بالکل سچ ہے کہ ان ہی بنیادوں
پر ہمارے نئے ادب کی عمارت تیار ہوئی۔

مولانا اسمٰعیل اگرچہ اس ماحول سے الگ ہیں لیکن سر سید جیسی بزرگ ہستی
ان کی ہمت بڑھانے اور صحیح راستہ بتلانے کے لئے موجود تھی۔ انہوں نے مولانا کو
مقفّی و مسجع عبارت میں تصنیف کرنے سے باز رکھا اور فارسی محاوروں کی بجائے
اردو محاورے استعمال کرنے کا قیمتی مشورہ دیا۔ ان کی یہ نصیحت کارگر ثابت ہوئی
انہوں نے ایسی نظمیں لکھنی شروع کیں جو نیچرل شاعری سے متعلق تھیں۔ انہوں نے
نظموں میں ایسا دل نشین انداز اختیار کیا جس کے باعث ہر تلخ بات مصری کی ڈلی
گوارا بن گئی۔

وہ اردو کے ان خدمت گزاروں میں سے ہیں جن کی ادبی کارگزاریاں ہمارے
ادب کو بہتر بنانے میں صحیح معنوں میں کارآمد ثابت ہوئی ہیں۔ ان کا ایک شعر
پڑھا تھا اب تک میرے ذہن میں گھوم رہا ہے جو سادہ ہونے کے باوجود
گیا ہے۔

ہر جل رہی ہے پن چکی — دُھن کی پوری ہے کام کی پکی

ان جیسے کتنے اشعار ہوں گے جو اپنی سلاست کی وجہ سے کتنے ذہنوں میں
ہوں گے۔

ان کا ادب خاص طور سے ایک مقصد کو سامنے رکھ کر زندگی کو نئے سانچے
ڈھالنے کے لئے دل و دماغ کو تیار کرتا ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جنہوں

مقالہ اجلاس سالانہ کانفرنس میں ۵ اکتوبر ۱۹۵۲ء کو جلسہ شعبہ تصنیف و تالیف میں
علامہ سلیمان ندوی مرحوم کی صدارت میں پیش ہوا۔ — مطبوعہ العلم اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، کراچی

نے محض شعر کہہ کر نہیں بلکہ اپنے عمل سے قوم کے بچوں کے ذہن کو جلا دی۔ انہیں فکر و کار راستہ بتایا۔ ان کے دل میں خدمت کا صحیح جذبہ موجود تھا جس کو وہ پوری طرح سے عمل میں لائے۔

ان کی پیدائش اس زمانہ میں ہوئی جب ہندوستان کی سیاسی فضا مکدر ہو چکی تھی۔ غدر کے زمانہ میں ان کی عمر ۱۴ سال کی تھی۔ فارسی، عربی کے ساتھ ساتھ علم مندرا فزیکل سائنس اور علم ہیئت کے مضامین بھی پڑھے۔ اور میری کی تعلیم کے لئے رڑکی گئے لیکن کسی سبب سے داخلہ نہ ہو سکا۔ یہ اچھا ہی ہوا اگر کہیں داخلہ مل جاتا تو ان کی جولانیِ طبع ان کو دوسری جانب مائل کر دیتی اور اس طرح وہ زبان و ادب کی دلچسپیوں میں پوری طرح حصہ نہ لے سکتے تھے۔

بعض شاعروں کی طرح وہ کسی بری سوسائٹی میں داخل نہیں ہوئے۔ بڑھاپے میں تو ہر رند پارسا بن جاتا ہے لیکن پھر بھی بعض دفعہ دل میں چھپے ہوئے گناہ آنکھوں کے دریچے سے جھانکنے لگتے ہیں۔ اسمٰعیل میرٹھی ان خوش قسمت انسانوں میں سے تھے جن کی نگرانی اور سرپرستی والدین کے سایہ میں ہوئی جس نے انہیں ہمیشہ برائیوں سے دور رکھا۔ اسی لئے مطالعۂ کتب اور اضافۂ علم کے لئے اساتذہ سے ربطِ علمی ان کے محبوب مشاغل تھے۔ یہ زمانہ زیادہ تر میرٹھ میں گزرا۔ اس کے بعد ملازمت کے سلسلہ میں آگرہ جانا پڑا جہاں ان کے ادبی ذوق میں جلا پیدا ہوئی اور دنوں میں ان کی شہرت کو چار چاند لگے۔

تعلیمی ادارہ میں ملازمت کرنے کی وجہ سے انہیں خاص طور پر بچوں کی نفسیات کی طرف متوجہ ہونا پڑا اسی لئے ایسی کتابیں تصنیف کیں جو زبان کی ترقی میں بہت

کار آمد ثابت ہوئیں۔

وہ جانتے تھے کہ ایک شاعر کا مقصد خاص طور سے بچوں کے دل و دماغ کو نفسیاتی لحاظ سے اس طرح تیار کرنا ہے جو ان کے ذہن میں کھرے اور کھوٹے کی تمیز پیدا کرنے کا شعور پیدا کر دے۔ انہوں نے ایسی چیزوں کو سامنے رکھا جن پر نظر تو جاتی ہے لیکن ہم توجہ نہیں کرتے بقول آل احمد سرور "بات اسی زبان ہو جس میں قابلیت کا زور اور انشاء پردازی کی شان نہ ہو۔ بلکہ خلوص کی جھلک اور بڑے مقصد کی چاشنی ہو۔" ان کی نظمیں بالکل اسی انداز میں ہیں جس انداز کو ہمارے تنقید نگار نے گزشتہ الفاظ میں سراہا ہے۔ ان کی نظمیں آرٹ کی خاطر نہیں۔ ان کے ہاں حقیقت کو نمایاں کرنے کے لئے عریانی نہیں۔ اُن کے ہاں خلوص کی جھلک بھی ہے اور سادگی بیان بھی۔ اس کے ساتھ ساتھ پیرایۂ بیان میں لطافت بھی موجود ہے۔ اگر بچوں کے لئے کہانیاں ہیں تو جوانوں کے لئے بھی دلچسپیاں موجود ہیں۔ ان کی زبان میں بیرونی نامانوس اور ثقیل الفاظ کی کھپت نہیں۔ انہوں نے ایسے ٹھیٹ الفاظ استعمال کئے ہیں جن کو بچوں سے لے کر بوڑھے تک سب آسانی سے سمجھ لیں اور دلچسپی اس لئے اور زیادہ قائم رہتی ہے کہ یہ الفاظ ہماری گھریلو زندگی کی جان ہیں۔

ذیل کی نظم کا عنوان "ملمع کی انگوٹھی" ہے جو ہمارے ثبوت کے لئے کافی ہے۔

چاندی کی انگوٹھی پر جو سونے کا چڑھا جھول
اور مجھ سے لگی بولنے اترا کے بڑا بول

چاندی کی انگوٹھی کے نہ میں ساتھ رہوں گی
وہ اوچھی ہے میں اور یہ ذلت نہ سہوں گی

میں قوم کی اونچی ہوں، بڑا میرا گھرانا
وہ ذات کی گھٹیا ہے نہیں اس کا ٹھکانا

میرا سا نہ رنگ اس میں نہ میری سی دمک ہے
چاندی ہے کہ رانگ مجھے اس میں بھی شک ہے

میری سی کہاں چاشنی میرا سا کہاں رنگ — وہ مول میں اور تول میں ہیں گے نہیں پاسنگ

اے دیکھنے والو! تمہیں انصاف سے کہنا — چاندی کی انگوٹھی بھی ہے کچھ گہنوں میں گہنا

یہ سنتے ہی چاندی کی انگوٹھی بھی گئی جل — اللہ رے ملمع کی انگوٹھی تری چھل بل

سونے کے ملمع پہ نہ اترا مری پیاری — دو دن میں بھڑک اس کی اتر جائے گی ساری

کچھ در حقیقت کو چھپایا بھی تو پھر کیا — جھوٹوں نے جو سچوں کو چڑایا بھی تو پھر کیا

کھوٹے کو کھرا بن کے نکھرنا نہیں اچھا

چھوٹے کو بڑا بن کے ابھرنا نہیں اچھا

اس اندازِ کلام سے زبان میں شیرینی بھی آگئی اور بیان میں وسعت بھی۔ ان کے کلیات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے معمولی معمولی چیزوں پر طبع آزمائی کی اور ان کو قابلِ توجہ بنا دیا۔ اسی لئے آپ کے ہاں غزل کی بہ نسبت مثنویوں اور قطعات کی کثرت ہے۔

ان کی کوئی مثنوی ایسی نہیں ملتی جس میں زہرِ عشق وغیرہ مثنویوں کے مثل اشعار ہوں جس سے جذبات میں ایسا تلاطم ہو جو اخلاق کی طرف سے انسان کو کنارہ کش کر دے۔ ان کی نظمیں اور مثنویاں بے کیف و بے رنگ الفاظ کو سمیٹے ہوئے نہیں ہیں بلکہ ان میں دلچسپی کا سامان موجود ہے۔ ساون کے مہینے میں جھڑی کا لطف کون نہیں اٹھاتا۔ مینڈک کے ٹرانے کی آواز کس کے کان میں نہیں آتی۔ جھینگر کی آواز کون نہیں سنتا۔ کوئل کی کوکو کس کو اپنی طرف مخاطب نہیں کرتی لیکن ان احساسات کے اظہار کے لئے طاقتِ بیان چاہئے۔ انہی احساسات کو اسمٰعیل میرٹھی کی زبان سے سنئے۔

گھٹا کا تن گیا ہے شامیانہ — بجایا رعد نے نقارخانہ

گھٹا کس سوچ میں چپکی کھڑی ہے — برس، آخر تو ساون کی جھڑی ہے

بھنبیری اُڑ کے ساون آگیا اب — گھٹا اُمڈی ہے بادل چھا گیا اب

کہو کوئل سے اور دو دن میں بولے — پھدک ٹہنی پہ تو بھی او ممولے

کٹورا سا ہوا تالاب لبریز — کہو مینڈک سے اپنی لے کرے تیز

زباں اپنی بھگو لے اے ٹٹیری — بجالے تو بھی اے جھینگر نفیری

جس طرح سعدی کا مرثیہ "معتصم" حالی کا مرثیہ حکیم محمود خان، فارسی و اردو ادب میں شاہکار ہیں اور اس سے نہ صرف شاعروں کے جذباتِ محبت کی ترجمانی ہوتی ہے بلکہ یہ مرثیے پوری "تاریخ" کا خلاصہ ہے۔ اور ان کے مرنے نے عالم کو جس طرح متاثر کیا ہے اس کا اظہار ہے۔ دونوں شاعروں نے اس صحیح احساسِ غم کا اظہار کیا ہے جس غم کو وہ عالمگیر سمجھ رہے ہیں اور اس کے اثر سے ایک عالم کو محوِ بکا دیکھتے ہیں ان دونوں کے نقطۂ نظر کی اہمیت اس لئے اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے کہ دونوں افراد کی زندگی عوام الناس کی حیات کا باعث تھی۔

لیکن اسمٰعیل میرٹھی کا قلعہ اکبر آباد پر مسدس بھی ان دونوں سے کسی صورت میں کم نہیں۔ ان کا مرثیہ پورے دورِ مغلیہ کی تاریخ ہے۔

زمانہ کی بلندی و پستی کا نقشہ شاعر کے چابک دست قلم نے جس انداز سے کھینچا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔

اڑتا تھا یہاں پرچمِ جاہی اکبر — بجتا تھا یہاں کوسِ شہنشاہی اکبر

ایک ایک بند توجہ کے قابل ہے۔

یہ جو عمارات کہ ہیں وقفِ تباہی — اسلاف کے اوصاف پہ دیتی ہیں گواہی

صرف اصل و نسب ہی پر نہ تھے اپنے مباہی　　مکتب میں تھے استاد ریاضی و الٰہی
میدانِ مساعی میں تھے اک مردِ سپاہی　　زیبا تھا انہیں چترِ جہاں بانی و شاہی
کتراتے تھے محنت سے نہ آرام سے تھکتے　　کوشش کی گھٹائیں تھے وہ بجلی کے کڑکے

اور اب کیا ہے شاعر کی زبان سے سنئے۔

اس عہد کا باقی کوئی ساماں ہے نہ اسباب　　فوارے شکستہ ہیں تو سب حوض ہیں بے آب
وہ جامِ بلوریں ہیں نہ وہ گوہرِ نایاب　　وہ خیمۂ زرتار نہ وہ بسترِ کمخواب
ہنگامہ جو گزرا ہے سو افسانہ تھا یا خواب　　یہ عرضِ غلام تھا وہ موقفِ حجاب
وہ بزم نہ وہ دور نہ وہ جام نہ ساقی　　ہاں طاق و رواق اور در و بام ہیں باقی
وہ دور ہے باقی نہ وہ ایام و لیالی　　جو واقعہ حسی تھا سو ہے آج خیالی
ہر گوشہ کہ ویران ہر اک منزلِ عالی　　عبرت سے ہے پُر اور مکینوں سے ہے خالی
آقا نہ خداوند۔ اعالی نہ موالی　　جز ذاتِ خدا کوئی نہ وارث ہے نہ والی
یہ جملہ محلات جو سنسان پڑے ہیں　　پتھر کا کلیجہ کئے حیران کھڑے ہیں

مولانا کا مقصد اس نظم سے یہ نہیں تھا کہ اسلاف کے کارنامے سنا کر انہیں سُلا دیں اور قوم کو "پدرم سلطان بود" کے خواب میں سرمست کر دیں۔ بلکہ وہ انہیں ہمت دلا کر مستقبل کو بہتر بنانے کے لئے تیار کرتے ہیں۔ وہ اس جوشِ عمل کے قائل ہیں جو قوم کو حرکت میں لے آئے۔ آگے چل کر وہ اس انداز سے کہتے ہیں جس طرح کوئی جرنیل اپنے سپاہیوں کی ہمت بڑھا کر انہیں مقابلہ کے لئے تیار کرتا ہے۔

ہے ہم کو اگر ان کے خلف ہونے کا دعویٰ　　دکھلاؤ حریفوں کے مقابل ہنر اپنا
ترتیب سے جم جاؤ قرینہ بہ قرینہ　　میدانِ ترقی میں لڑو سینہ بہ س

غدر کے بعد قوم پر ایسا جمود طاری تھا جس کو توڑنے کے لئے سعی پیہم کی ضرورت تھی۔ وہ اس پُرآشوب دور سے گزر کر ہمت باندھ کر نکلنے کے لئے مردانہ وار جوش دلاتے ہیں۔ زندگی سدھارنے کی خاطر اپنی قلم کی جولانیاں تیز کرتے ہیں اور عمل کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔

ہمت ہی حرارت ہے وہی ہے حرکت بھی　　ہمت ہی سے ہر قوم نے پائی ہے ترقی
گر چیونٹی تیمور کی ہمت نہ بڑھاتی　　ہتھیار بھی بے کار تھے اور فوج بھی
ہمت ہے سرانجام مہمات کی کنجی　　ہمت ہی حقیقت میں ہے توفیقِ الٰہی
ہمت ہی بنا دیتی ہے مفلس کو تونگر　　ہمت کے سفینے کا اُٹھا دیجئے لنگر

مسدس حالی (۱۸۷۹ء) کو خلاف توقع جو قبولیت حاصل ہوئی اس کا سبب خود حالی کا خلوص تھا۔ جس کا اثر مسدس کے ہر ہر شعر سے ظاہر تھا۔ حالی کی آواز آفاقی تھی۔ جس کا اندازہ اسی وقت ہو چلا تھا۔ مولانا اسمٰعیل میرٹھی نے قلعہ اکبر پر یہ نظم ۱۸۸۰ء میں لکھی۔ تاریخی لحاظ سے یہ بعد کی لکھی ہوئی ہے۔ شروع میں اس نظم کا اندازِ بیان بہت پُر شکوہ ہے اور مصنف نے اپنی پوری قوتِ بیانی سے کام لے کر اپنے دور کے لوگوں کے سامنے جاہ و جلال مغلیہ کی جامع تصویر پیش کی ہے اور پھر اپنی قوم کی طرف گریز کیا ہے۔ اس سے یہ امر واضح ہے کہ حالی کا اثر اسمٰعیل میرٹھی پر پڑا۔ جس طرح حالی کی آواز آج تک فضا میں گونج رہی ہے۔

قوم کی عزت اب ہنر سے ہے　　علم سے یا کہ سیم و زر سے ہے
کوئی دم میں وہ وقت آئے گا　　بے ہنر بھیک تک نہ پائے گا

بالآخر اسمٰعیل میرٹھی بھی اسی رنگ کو لے کر چلے اور اپنی شاعری کا صحیح مصرف

یہ کیا کہ پوری کوشش سے قوم کو عمل کی طرف متوجہ کیا اور انہیں اچھی طرح جھنجھوڑا۔

تم جانتے ہو خوب کہ انسان ہے فنائی — فانی ہے بلاشبہ مگر اس کی نشانی
کیا اس کی نشانی ہے سنو میری زبانی — امثال میں مذکور ہے پچھلوں کی کہانی
خوش بخت تھے وہ کر گئے جو فیض رسانی — بدبخت تھے مغلوب صفات حیوانی
گر تم بھی یوں ہی اٹھ گئے حیوان سے رہ کر — آئندہ کی نسلیں تمہیں کیا روئیں گی کہہ کر

مسلمانوں کی علمی ترقی اور اس میں سعی ان کی دلی مراد تھی اور اس کے لئے انہوں نے مقدور بھر پوری کوشش کی۔ ۱۹۱۰ء میں ایک وفد یونیورسٹی کے چندے کے لئے میرٹھ آنے والا تھا بعض صاحبان کی یہ رائے ہوئی کہ اس وفد کو ابھی نہ بلایا جائے۔ اسمٰعیل میرٹھی اس رائے کے سخت خلاف تھے۔ انہوں نے پرزور الفاظ میں اپنی رائے کا اظہار کیا۔ چنانچہ جب وفد نواب وقار الملک کی سرکردگی میں میرٹھ آیا تو انہوں نے ایک قصیدہ "نوائے زمستان" میں پورے طور سے ان کمزوریوں کا اظہار کیا جن کا دور کرنا ضروری امر ہے جس میں اقتصادی بدحالی کا خاص طور سے ذکر ہے جس سے ظاہر ہے کہ حساس دل ان تمام امور کی طرف دیکھ رہا ہے جو مسلمانوں کو اچھائیوں سے برائیوں کی طرف لے جا رہے تھے۔

انہوں نے سرسید اسکول کی تائید پورے طور سے کی اور اپنی قوم کی اصلی حالت کو ظاہر کرنے کی جو روش اختیار کی اس سے ان کے بیدار ہونے کا پوری طرح ثبوت ملتا ہے۔ ان کے رجحانات اور میلانات پوری طرح اس طرف مائل تھے جن پر سرسید کی تحریک کی بنیاد تھی اور اس تحریک میں انہوں نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔

یہی نہیں بلکہ اسی دور میں (بیسویں صدی کے آغاز) جبکہ مغرب زدہ دماغوں میں یورپی نقالی کا ایک اثر پیدا ہو چلا تھا۔ اس پر بہت سخت انداز میں نکتہ چینی کی۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ نہ صرف شاعر تھے بلکہ نقاد کی حیثیت بھی رکھتے تھے۔ اس کو انہوں نے اپنے انداز میں خوب بیان کیا ہے۔

ضرورت میں داخل ہے ناول نگاری — ہیں ناول نگاری پہ شیدا سخنداں
ہوئے خواب ہر چند اگلے فسانے — نہ وہ نجم و ناقہ نہ خار مغیلاں
نہ زنبیل عیار و لوح طلسمی — نہ دیوان قاف اور نہ اندر کی پریاں
مگر ناولوں میں یہ تقلید یورپ — پرانا مرض ہے بہ تبدیل عنواں
بہا پھوٹ کر دوسری سمت پھوڑا — وہی خلط فاسد ہے مائل بسیلاں
ہمارے یہ قومی رسالے تو دیکھو — کھلاتے ہیں کیا گل خیابان خیاباں
ہماری غذا ہیں یہ ماہانہ پرچے — تغزل کا تیار ہے خوان الواں
جوانان نوخواستہ بن گئے ہیں — ہزاروں غزل گو ہزاروں غزل خواں

اسمٰعیل نے بہت اچھے انداز میں اس نئے طبقہ پر چوٹ کی ہے جس کا کام صرف یہ تھا کہ وہ نام نہاد رسالے نکال کر قوم کے مذاق کو خراب کریں اور شاعروں میں غزل گوئی ان کا محبوب مشغلہ ہو۔ وہ کہتے ہیں۔

نہ سیکھا حساب اور فن مساحت — رہے ناپتے طول شب ہائے ہجراں

غزل سے۔ مولانا اسمٰعیل کی ایک خاص چیز جس کی طرف توجہ کم کی گئی ہے وہ غزل گریزی ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ وہ خود حالات کے لحاظ سے نظم کی طرف زیادہ توجہ دے چکے تھے اور اس میں بڑی خدمت بھی کی جس کا ذکر ہم پہلے کر چکے

ہیں۔ وہ شروع ہی سے کچھ اس کی طرف مائل نظر نہیں آتے۔ اسی لئے اُن کی غزلیں گنتی کی ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ ان کی طبیعت ان مضامین میں سے دل برداشتہ نظر آتی ہے کہ جس پر لاتعداد شعراء اپنی طبع آزمائی پہلے سے کر چکے ہوں۔ ابتذال سے تو انہیں سخت نفرت ہے۔ دبستانِ لکھنؤ کی طرف وہ مائل نہیں ہیں۔ ایک خاص چیز جو اُن کے ہاں پائی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ ان کی اکثر غزلوں میں سوز و گداز کی کمی ہے وہ الفاظ کی نشست، تراکیب کی چستی، قوافی کی برجستگی پر زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ گویا ان کے ہاں غزل کا ادب برائے فن ہے اور اس سلسلے میں ناسخ کی پیروی کرتے ہیں۔

فلسفۂ عشق و تصوف کی اعلیٰ قدریں بھی ملتی ہیں۔ وہ مضامین کو ادا کرنے کے لئے آسانیوں کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ اسی لئے فارسی تراکیب اور مرکب الفاظ کی طرف مائل ہیں۔ مثلاً حسنِ محرک، بقدر وسعت یک گام، ناصیہ سا، نقشِ کفِ پا، پاشکستہ، رہ و مسلکِ توکل، مبداءِ فیاض، حاجت اموزش، گم کردہ راہ، تیغِ براں، قوم، سر بجیبِ علم، اسیرِ حیلۂ شکم، پابدامانِ ہستی، زخم خوردہ، فریبِ وفا۔ بلکہ بعض بعض جگہ تو ان کی غزل میں شوکتِ الفاظ اس قدر ہے کہ غزل، غزل نہیں رہتی۔

یہ تو صحیح ہے کہ وہ شاعری میں میر کی میری کے قائل ہیں جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ سودا بھی تھا استادِ زمانہ — میری تو مگر میر ہی تھا شعر کے فن میں

لیکن ان کے ہاں سوز و گداز شروع کی غزلوں میں بہت کم ہے۔ جہاں فلسفہ عشق و تصوف کے مسائل ہیں وہاں ان کا انداز عام فہم نہیں ہے۔

حسن کو عنایتِ ازلی سے ہے چشم داشت — وہ معتقد دعا کے نہ قائل دوا کے ہیں

کمالاتِ صانع پہ ہے جن کی نظر — وہ خوبیٔ مصنوع کم دیکھتے ہیں

ہوں کنجِ قفس میں بند لیکن — بیرونِ زمین و آسماں ہوں

(تذکرۂ غوثیہ و حضرت غوث علی شاہ:۔) ان کے کلام میں تصوف کا اثر مولانا سید غوث علی شاہ پانی پتی کی تربیتِ باطن کی بدولت ہے اور اسی سلسلے میں ان کی ایک کتاب "تذکرۂ غوثیہ" (۸۳-۱۸۸۲ء) بھی ہے انہیں کی غزلیں ۸۶ ہیں۔ کئی ایسی ہیں جو غالب کی زمین میں ہیں۔ وہ غزل میں گل و بلبل کا سہارا نہیں ڈھونڈھتے۔ اسی لئے ان کے ہاں رنگینیٔ بیان اکثر غزلوں میں نہیں ہے۔ مے و شاہد، جام و سبو کا تذکرہ بھی بہت کم ہے۔ البتہ طنز، طعن و تشنیع کی طرف وہ مائل بہ پرواز نظر آتے ہیں۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آیا انہوں نے کل ۸۶ غزلیں کہیں ہیں یا یہ انتخاب کیا گیا ہے۔

ان کی غزلیں زبان و بیان کے لحاظ سے بہت معیاری ہے۔ ان کے ہاں فن برائے فن ہے۔ نہ کہ فن برائے زندگی۔ شروع شروع میں بالکل غالب کی طرح انہوں نے الفاظ کی طرف زیادہ توجہ دی۔ اسی لئے فارسی تراکیب کی کثرت ملتی ہے۔ جس میں کوہ کندن و کاہ برآوردن کی مثال صادق آتی ہے۔ انہوں نے خود فرمایا تھا کہ آخر میں دوستوں کی صلاح سے صاف گوئی اور سادہ بیانی اختیار کر لی۔ غالب اور داغ کے مطالعہ نے ان کو اس راہ پر لگا دیا جس سے غزلوں میں سادگیٔ بیان کے ساتھ صادق کثیر کا لطف بھی پیدا ہو گیا۔ غزل میں غالب کو وہ اپنا استاد تسلیم کرتے ہیں۔

ان کی کئی غزلیں اسی زمین میں ہیں۔

مہربانی بھی ہے عتاب بھی ہے — کچھ تسلی بھی کچھ اضطراب بھی ہے

ایک فرشتے بھی تو ہیں جن کو نہ محبت ہے نہ رنج
خواہشیں دل کی بلائے جانِ انساں ہو گئیں

کیا ہے وہ جانِ مجسم جس کے شوقِ دید میں
جامۂ تن پھینک کر روحیں بھی عُریاں ہو گئیں

جو بنا ئیں تھیں کبھی ایوانِ کسریٰ کا جواب
گردشِ افلاک سے گردِ بیاباں ہو گئیں

اسی طرح غالب کی زمین میں ایک مرثیہ اپنے جوان مرگ داماد کے ماتم میں بشکل غزل لکھا۔ یہ غم کا پہاڑ ان پر ایسا ٹوٹا کہ وہ بے تاب ہو گئے اور بڑھاپے میں یہ صدمہ جاں گداز بن گیا۔ اس غزل میں وہ غالب کے انداز کو نہیں بھولتے۔

کیا ہو گیا اسے کہ تجھے دیکھتی نہیں	جی چاہتا ہے آگ لگا دوں نظر کو میں
جز درد و داغ تو نے نہ چھوڑا نشان حیف	رکھوں گا میہماں انہیں عمر بھر کو میں
کیا فکر اب وفاں کہ غم کہہ رہا ہے اب	موجود ہوں ضیافتِ دل اور جگر کو میں

ایک شعر قابلِ توجہ ہے۔

کچھ میری بات کیمیا تو نہ تھی	ایسی بگڑی کہ کچھ بنی ہی نہیں

ان کے کلام میں بعض جگہ داغ کی جھلک بھی ملتی ہے۔

مٹا ڈالیے لوحِ دل سے غبار	کسی سے خطا بھی اگر ہو گئی
وقت ملنے کا معین کیجئے	خواہ فردائے قیامت ہی سہی

غالب کے اثر نے ان کی غزل میں معنویت پیدا کر دی اور سوز و گداز بھی۔ اب ان کی غزل آفاقی بن گئی۔ شاعر کا غم، غمِ جاناں نہ رہا، غمِ روزگار ہو گیا۔

اُن کا گھر اہلِ علم و فضل کی آمد کے لئے کھُلا تھا۔ سر سید۔ حالی اور ذکا اللہ میرٹھ آتے تو اُن سے ضرور مل کر جاتے۔ ایک دفعہ حالی میرٹھ تشریف لائے، غزل کی فرمائش کی۔ غزل سنائی گئی جب یہ شعر سنے پھڑک گئے

بس اے رنگ و بو تو نہ کر ناز بیجا	خدا جانے کیا بات ہم دیکھتے ہیں

بار بار سنا اور خوب تعریف کی۔

کہیں کہیں اکبر کا رنگ بھی اپنی جھلکیاں دکھاتا ہے۔ زاہد کی مٹی پلید کرنے میں وہ چوکتے نہیں۔

کی ہے زاہد نے آپ دنیا ترک	یا مقدر میں اس کے تھی ہی نہیں

غرض اسمٰعیل ہمارے ادب میں ایک ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ اور ان کا شمار بھی ادب کے ان خدمت گزاروں میں ہے جنہوں نے واقعی ترقی پسند ہونے کا ثبوت دیا اور صالح ادب پیدا کر کے انہوں نے ادب کی بنیادوں کو زیادہ مضبوط بنا دیا۔ جہاں آزاد و حالی کی خدمات کا تذکرہ ہو گا وہاں پر اسمٰعیل بھی نظر آئیں گے اور میرے خیال میں یہی چیز ان کی تابندگی کی دلیل ہے۔

حالی کے ہم عصر عالی کی مثنوی

حالی نے اپنے شعر سے مخاطب ہو کر کیا خوب کہا ہے ؎

صنعت پہ ہو فریفتہ عالم اگر تمام — ہاں سادگی سے آئیو اپنی نہ باز تو

اسی لئے اُن کی کوشش ہمیشہ یہ رہی کہ شعر میں صحیح اور سچی بات بیان کی جائے اور اغراق سے احتراز۔ یہی وہ خصوصیات تھیں جس نے حالی کے کلام کو دوام بخشا۔ اور ان کا کلام قوم کے نام ایک حیات بخش پیغام تھا جس کو پہنچا۔ اس نے حسبِ استعداد قبول کیا اور اب وہ اردو زبان اور ہماری تہذیب کی ایک عزیز دولت ہے جس سے اہلِ نظر اور اہلِ دل صدیوں استفادہ کرتے رہیں گے۔

حالی نے جدید شاعری کے متعلق جو کچھ اظہار کیا وہ اس قدر حقیقت لئے ہوئے تھا کہ اس نے تمام قوم کو چونکا دیا اور یہ عام طور سے محسوس کیا جانے لگا کہ ہماری زندگی کے لئے اب ایک موڑ کی ضرورت ہے جو ہمارے اقتصادی، سیاسی اور تعلیمی حالات کو بدل دے ورنہ اگر ہم نے ان تبدیلیوں کے لئے اپنے آپ کو تیار نہیں کیا تو ہم ہر لحاظ سے سب سے پیچھے رہ جائیں گے اور یہ بات خاص طور سے قابلِ توجہ ہے کہ جنگِ آزادی کے بعد مسلمانوں پر ایک افسردگی و کم مائگی کا جو اثر دماغ پر غالب آچکا تھا اس نے تمام اعضا

لوج بنا دیا اور پست ہمتی کے سب ترقی کی راہوں کی طرف سے منہ موڑ لیا تھا۔

دہلی کے قرب و جوار کا علاقہ خاص طور سے اس جنگِ آزادی سے متاثر ہوئے بغیر ہو سکا۔ اتفاق سے حالی اسی علاقے کے باشندے تھے۔ پانی پت مسکنِ قدیم تھا۔ دلی ان کے لئے ترقی کا میدان۔ پانی پت و دلی کا فاصلہ ہی کتنا پچیس۲۵ کوس تو ۔ وہاں کے تباہ حال خاندانوں میں سے بہت سے لوگوں نے پانی پت کو منتخب اور دلی سے بھاگ کر یہاں آگئے۔ اس زمانہ میں غدر کے تین چار سال تک میں رہے اور تحصیلِ علم کرتے رہے۔ آخر کار حالی کو بھی فکرِ معاش میں گھر سے لنا پڑا۔

۱۸۷۴ء کا سال ہماری جدید شاعری میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے جبکہ یک نئے قسم کے مشاعرے کی بنیاد لاہور میں پڑی۔

اس وقت تو کیا بلکہ کچھ عرصہ تک یہ معلوم بھی نہ ہو سکا کہ ہماری جدید شاعری کا گِ بنیاد جو لاہور میں رکھا گیا ہے اس نے کس کس کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ اور اس اثرات محض لاہور تک محدود نہیں بلکہ دور دور تک پہنچ گئے۔ لیکن جوں جوں مانہ گزرتا گیا یہ معلوم ہوتا گیا کہ ہمیں کن تقاضوں کی ضرورت ہے اور اس جنگِ آزادی جو نقصانات پہنچ چکے ہیں ان کی تلافی کس طرح ہو سکتی ہے۔ گویا جدید اعری حالاتِ زمانہ کے لحاظ سے جن تقاضوں کی طرف متوجہ کرتی ہے لوگوں کو جہ کرنے کے لئے سرسید کی علمی کوششیں اب واضح طور پر سامنے آچکی تھیں۔

زیرِ نظر کتاب جس انسان کی تصنیف ہے اس کا وطن پانی پت سے سات میل مشرق کی طرف دریائے جمنا کے کنارے پر بستا تھا۔ یہ بستی سادات کی تھی اور

مردم خیز خطہ تھا[1] جہاں اکثر صاحبانِ علم پیدا ہوئے جنہوں نے علوم عربی و فارسی و علو
میں کمال حاصل کیا تھا۔ قصبہ برست (جس کو بستی کہنا زیادہ مناسب ہے) غدر کے ز
تک ۶، ۵ ہزار کی آبادی تھی۔ اس کا اصل نام موضع رسول برشط تھا جو مخدو
کے بعد برست رہ گیا۔ ظاہر ہے کہ ان عالموں کے سبب جو اس زمانے میں تھے
نواب حامد علی خاں[2] کے اثرات کے باعث برست کسی زمانے میں ایک اچھا خا
مقام تھا۔

مولوی احمد حسین صاحب اس مثنوی کے مصنف اسی قصبہ کے باشندے
والد کا نام سید غلام حسن تھا اور مورثِ اعلیٰ سید غلام حیدر (جو بانی قصبہ برست
تھے) سید غلام حیدر کے والد ماجد سید جمال الدین موضع سرسی ضلع مراد آباد میں
مدفون ہیں۔ اس طرح یہ سلسلۂ نسب ابوالفرح واسطی پر ختم ہوتا ہے جو زید شہید
اولاد سے ہیں۔

مولوی احمد حسن صاحب مرحوم کے اور چار بھائی تھے۔ سب سے بڑے سید محمد حس
صاحب گاؤں میں نمبردار تھے۔ اس زمانہ میں نمبردار گاؤں کا چودھری و سرپنچ ہوتا
ان سے چھوٹے مولوی سید علی حسن صاحب جو لکھنؤ میں تحصیل علم کے لئے رہ گئے تھ
متبحر تھے۔ انہوں نے شرائع الاسلام (شیعی فقہ پر مستند کتاب) پر حاشیہ لکھا ہے
(حاشیہ لکھنا یعنی اس کی توضیح و تشریح کرنا ایک بہت ہی اہم کام تھا جو کسی کے عا
ثبوت کے لئے کافی تھا) ان سے چھوٹے مولوی سید جعفر حسین صاحب اور سب سے

---

[1] تذکرہ بے بہا فی تاریخ العلماء۔ مولفہ مولوی محمد حسین نوگانوی۔ مطبوعہ دہلی سنہ ۱۹۳۰ء
[2] نواب حامد علی خاں کا ذکر اس سے قبل کے صفحات میں آچکا ہے۔

مولوی سید نیاز حسن صاحب تھے جو درجۂ اجتہاد پر پہونچے ہوئے تھے۔
اس تفصیل سے ان کے خاندان کی علمی حالت پر روشنی ڈالنی مقصود ہے۔ ظاہر ہے
نے خود کیسے علمی ماحول میں پرورش پائی ہوگی۔ موجودہ دور میں اولین تربیت
(گھر) میں بچہ کی تربیت اور اس کی صلاحیتوں کی نشو و نما پر توجہ کم دی جانے لگی ہے
کہ بچہ کی تربیت صحیح طور سے مدرسہ میں نہیں ہوتی ہے۔ سب سے پہلے گھر کے
ماحول سے بچہ متاثر ہوگا تو وہ آگے چل کر انفرادی صلاحیتوں کی تکمیل کے بعد
مفید ہو سکتا ہے۔

مولوی احمد حسن صاحب حالی مرحوم کی ابتدائی تعلیم کے متعلق اتنا پتہ چلتا ہے کہ انہوں
اپنے خاندان میں علوم درسیہ معقول و منقول کی تکمیل کی۔ حالی مرحوم کے بڑے بھائی
نیاز حسن صاحب جب عراق سے تکمیل تعلیم فقہ کے بعد حیدر آباد پہونچے اور ان کے
کی شہرت نے سر سالار جنگ بہادر کو بھی اپنی طرف مائل کیا اور انہوں نے مولوی
حسن صاحب مرحوم کو حیدر آباد میں قیام کرنے کی طرف مائل کر دیا تو انہوں نے اپنے
بھائی حالی مرحوم کو برست سے بلوایا۔ حالی مرحوم پانچ چھ ماہ میں پیدل حیدر آباد
اور اپنے بھائی (مولوی نیاز حسن صاحب) کے پاس قیام کیا۔ چند روز کے بعد
حسن حالی مرحوم کا تعارف نواب مختار الملک وزیر مملکت سے کرایا۔ نواب
ان سے مل کر بہت خوش ہوئے اور اپنے خسر نواب فخر الملک کی جاگیرات کا
۔ اور نواب خان خانان اور فخر الملک خرد کا اتالیق کیا۔ اسی دوران میں
صاحب کو ایک مقام کی پیمائش کی ضرورت ہوئی۔ مولوی حالی مرحوم نے ارادہ
کر کے مقام معینہ پر روانہ ہوئے۔ بعد معائنہ مقام و موضع بحیثیت مجموعی

تفصیلی رپورٹ مع خاکہ پیش کی۔ نواب صاحب ازحد مسرور ہوئے اور مولوی صاحب
ہمہ دانی کی قدر فرماتے ہوئے مبلغ یک صد روپیہ ماہوار منصب نسلاً بعد نسلاً جار
فرمایا جو اب تک مولوی صاحب کی اولاد کو ملتا رہا ہے۔

نواب سالار جنگ مختار الملک کے انتقال کے بعد اُن کے فرزند سالار جنگ ثانی
میر لائق علی خاں بھی مولوی صاحب کی قدر و منزلت فرماتے رہے اور ان کی شاگردی
شرف حاصل کیا۔ اور بعد میں عہدہ دوم تعلقداری پر مامور فرمایا۔ غرض حالی مرحوم نے
سرکاری خدمات کو باحسن وجوہ انجام دیا۔ اور بعد میں خانہ نشین ہو گئے۔ مولوی صاحب
کے ایک فرزند سید مرتضٰے نے جو فاضل تھے عین عالم شباب میں انتقال کیا۔ بعد
انہوں نے (حالی مرحوم) تین فرزند چھوڑے۔ جن میں سے ایک فرزند رشید کرنل
حسن صاحب حیدرآباد میں اب بفضلہٖ موجود ہیں۱

حالی مرحوم کا سلسلہ درس و تدریس سرکاری خدمات کے باوجود جاری رہا۔
شاگردوں کو ایران سے کتابیں منگا کر دیں۔ ان کے خاص شاگردوں میں مولوی سلط
حسین مرحوم مبتلیٰ اور شیخ الطاف حسین رنگین ممتاز تھے۔

اخلاق و عادات

زیر بحث مثنوی حقیقت میں خود ان کی حق گوئی کا خاکہ
نہایت صلح کن مرنجان مرنج قسم کے انسان تھے۔ دائ
احباب وسیع تھا۔ اسی طرح حالی مرحوم کثیر پرور بھی تھے۔ تا بمقدور اپنے غریب
کو غیر کا دست نگر نہیں ہونے دیتے تھے۔ انہی خصوصیات کی وجہ سے مقبول تھے
مرحوم باوجود اپنی قدر و منزلت کے عام مسلمانوں کے کام آنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔
ایک دفعہ ایک صاحب کو حالی مرحوم نے ایک ہزار روپے بغرضِ تجارت قر

۱ اب مرحوم ہو چکے ہیں۔

قرض دیئے تھے۔ بعد میں کچھ ایسے واقعات رونما ہوئے کہ اُن صاحب سے رقم کی
ادائیگی نہ ہو سکی۔ لیکن اور قرض خواہوں نے دعوے کر کے ڈگریاں حاصل کر لیں۔
اس واقعہ کی اطلاع چند احباب نے حالی مرحوم کو کی اور یہ رائے دی کہ آپ کا قرضہ
مرجح ہے لہٰذا آپ درخواست دے کر قرقی ملتوی کرا دیجئے اور وصولی رقم کا انتظام
کیجئے۔ یہ سنکر فرمایا کہ میں ایک غریب مسلمان پر ازدیادِ فکر کا باعث نہیں بننا چاہتا۔ ایک تو
وہ یوں ہی قرض خواہوں کی وجہ سے پریشان ہیں اور پھر میں ایک دعویٰ اور کر دوں۔
میں نے معاف کیا۔

اسی ضمن میں ایک اور خاص واقعہ مولوی سید علی حیدر نظم طباطبائی کے متعلق ہے
کہ وہ حالی مرحوم کے خاص احباب میں تھے۔ لیکن دور رہتے تھے جس کی وجہ سے ہفتہ
دو ہفتہ میں آتے جاتے رہتے تھے۔ اسی درمیان میں حالی مرحوم نے اپنے شوق سے
ایک زمین خریدی۔ اور اس میں بہت کشادہ اور جدید طرز کا مکان بنوایا۔ دورانِ
تعمیر میں دفتر سے آ کر شام کو کام کا جائزہ لیتے اور حسبِ منشاء کچھ تغیر و تبدل کرتے جاتے
تھے۔ اس روز نظم طباطبائی بھی اتفاقاً ہمراہ تھے۔ نظم صاحب نے مکان کو دیکھ کر
اس کی وضع قطع کی بہت تعریف کی۔ اس وقت تو مرحوم خاموش رہے۔ لیکن مکان
آراستہ کر روز داروغہ کی معرفت اُس روز تک کا حساب اور ایک خط مولوی صاحب
موصوف (نظم) کی خدمت میں ارسال فرمایا کہ یہ مکان آپ کی پسند خاطر ہے۔ لہٰذا آپ
کی نذر ہے بہتر ہے کہ آپ اس محلہ میں تشریف لے آئیں۔ مولوی صاحب فوراً واپس آئے
اور اصرار فرمانے لگے کہ میں نے تو کسی اور خیال سے نہیں کہا تھا۔ خدا آپ کو مبارک
کرے۔ حالی مرحوم نے قبول نہیں فرمایا اور فرمانے لگے کہ اس سے بڑھ کر اور کیا برکت

ہوگی کہ آپ اس میں تشریف لائیں اور میری تقویت کا باعث ہو۔ چنانچہ مولوی صاحب (نظم طباطبائی) فوراً تشریف لائے اور مع اہل و عیال رہنے لگے۔

یہ چیز ان کی نیک نیتی کی دلیل ہے کہ اُن کے مکان کی جگہ اب تک اُن کے ہی نام سے مشہور ہے۔

حالیؔ مرحوم کو اپنے وطن سے بہت محبت تھی۔ حیدرآباد سے دوسرے تیسرے سال ضرور یہاں آتے۔ مرحوم نے وطن کا آخری سفر ۱۹۰۶ء میں کیا اور یہاں سے واپسی کے بعد ۱۰ صفر ۱۳۲۴ھ مطابق ۱۹۰۶ء میں حیدرآباد میں انتقال کیا۔

حالیؔ مرحوم کی فنِ شعر سے دلچسپی کافی تھی البتہ مرحوم نے غزل کی طرف توجہ نہیں کی۔ مرحوم کے چند مسدس، مراثی اور قصائد غیر مطبوعہ ہیں البتہ زیرِ نظر مثنوی مطبوعہ ہے جو بوجہ مقبولیت عامہ کے چند بار طبع ہوئی۔ اس کتاب کے متعلق اتنا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ۱۳۰۷ھ میں شائع ہوئی جو مرحوم کے انتقال سے ۱۷ سال قبل کا عرصہ ہوتا ہے البتہ یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس سے قبل یہ کس کس سنہ میں لکھی گئی۔

یہ مثنوی پند و نصائح میں گویا حالیؔ مرحوم کی گفتگو کا خاکہ ہے جو شعر کے لباس میں اپنے مقصد کو اور زیادہ پُر اثر بنانے کے لئے ہمارے سامنے موجود ہے۔ یہ اس انقلابی دور کی مثنوی ہے جبکہ مسلمانوں میں زوال پذیر جاگیردارانہ نظام کے زیرِ اثر نحبت و مفلسی بھی تھی اور عام معاشی حالت خراب ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے اخلاق انحطاط پذیر تھے۔ گویا اس مثنوی کو وہ مقبولیت عامہ حاصل نہ ہو سکی جو حالیؔ کی مسدس کو۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ یہ اس زمانہ میں چند بار شائع ہوئی اس طرح اس نے لوگوں کی اخلاقی حالت درست کرنے میں کافی مدد دی۔ سادگیٔ بیان اور خلوص

اس مثنوی کی جان ہے۔ حالیؔ مرحوم نے اپنی سوسائٹی میں جن خرابیوں کو دیکھا ان کو درست کرنے میں انہوں نے شعر کا سہارا لیا۔ وہ ایسے متوسط طبقہ کے انسان تھے جو اپنے عالمانہ جوہر کے سبب اعلیٰ طبقہ میں بھی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے اور خود چونکہ تکلیف کے دور سے گزرے تھے اس لئے غریبوں کی تکلیف کا احساس تھا۔ یہ وہ احساس تھا جو اپنے وطن کی طرف بار بار کھینچ کر لاتا تھا۔ اور یہاں سے وہ اپنے ہمراہ کسی نہ کسی فرد کو ساتھ لے جاتے تھے اور اس کی تعلیم و تربیت اور وجہ معاش میں مدد دیتے۔

جبکہ وہ خود ایک جگہ کہتے ہیں۔

کوئی مارا گیا لٹا کوئی
خویش و فرزند سے چھٹا کوئی

کردیا اکثروں نے ترکِ وطن
پہنچا جس کو جہاں ملا مامن

خانماں سے بچھڑ گئے اکثر
اہلِ دولت بگڑ گئے اکثر

مدتوں ملک کا یہ حال رہا
موردِ آفت و زوال رہا

دشتِ پُر خار نے ضیافت کی
فقر و افلاس نے رفاقت کی

ہوگئی پھر تو کثرتِ جہّال
لے لیا اپنے ساتھ مالِ کمال

یہی تعلیم زندگی میں ان کا مقصد رہا۔ نہ معلوم کتنے افراد ہوں گے جن کی زندگیاں بنا کر خاندانوں کو تباہی سے بچالیا۔ اور آج وہ آرام و اطمینان کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

زیرِ نظر مثنوی اپنی چند خصوصیات کے باعث قابلِ توجہ ہے۔ مثنوی میں جو قدیم [illegible] حمد و نعت کا رائج تھا وہ اس میں بدستور موجود ہے۔ اس کے بعد التجا بدرگاہ اللہ تعالیٰ ہے۔ اس کے معذرت کے طور پر چند شعر ہیں۔ پھر ترقی اسلام کے متعلق پھر تنزلِ اسلام کا مفصل تذکرہ ہے۔ اسلام کے تنزل کے بعد نصاریٰ کی ترقی کا ذکر ہے۔

اس کے بعد مختلف عنوانات پر اشعار لکھے گئے ہیں۔

ہر عنوان کا نام پہلے لکھا گیا ہے۔ مثلاً در بیان استعمال اشیائے ملکی۔ در بیان علاج بیماران، مذمت لہو و لعب وغیرہ۔ معاشرت لوازم، ترغیب اولاد، مذمت تغیر وضع و لباس بعد میں نماز روزہ کی پابندی کا بیان۔ خاتمہ پر محاسنِ اخلاق کے متعلق اشعار۔ اس طرح یہ مثنوی ۵۵۷ اشعار پر مشتمل ہے اور مطبع اخبار آصفی حیدر آباد میں باہتمام میر محمد حیدر دہلوی طبع ہوئی ہے۔

اس مثنوی کی خاص خصوصیت یہ ہے کہ ملک کے حالات سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے۔ جس جگہ ترقی اسلام کا ذکر ہے وہاں آنحضرت صلعم کی کوششوں کا خاص طور سے اور نماز روزہ کی پابندی کا خاص طور سے ذکر ہے۔

کی نبی صلعم نے پیغمبری نو سال   اکثر اس میں رہی جدال و قتال
جم گیا خوب پایۂ اسلام   ہو گیا دینِ حق کا استحکام
ہو گیا فضلِ ایزدِ باری   ہر جگہ حکمِ شرع تھا جاری

اس کے بعد تنزلِ اسلام کا ذکر ہے۔

خواہشِ نفس نے کیا مجبور   آخر کار ہو گئے مقہور

چند اشعار کے بعد

ہو گئی سلطنت تہ و بالا   نہ رہا کوئی پوچھنے والا
شرع کے ترک سے یہ حال ہوا   رفتہ رفتہ یہیں زوال ہوا
مسجدیں ہیں پڑی ہوئی سنسان   نظر آتے نہیں کوئی انسان
عقل کی ان میں کوئی بات نہیں   خیر کی جانب التفات نہیں

غیرت و شرم و ننگ و عار نہیں   نفس خیرہ پر اعتبار نہیں

آخری دور میں جو مسلمانوں کی کیفیت ہوئی تھی اس کا شاعر نے اس طرح اظہار کیا ہے جس میں حقیقت ہی حقیقت ہے۔

قابلیت نہیں کمال نہیں   بے کسانی پہ انفعال نہیں
چار پیسے جو ہاتھ میں آئیں   خوب اڑائیں پئیں کھائیں
اس لئے وقعت و وقار نہیں   غیر قوموں میں اعتبار نہیں
بگڑے سب کاروبار دیکھ چکے   اپنا انجام کار دیکھ چکے

اس کے بعد شاعر ان افراد کی طرف متوجہ ہو کر انہیں غیرت و شرم دلا کر موجودہ زمانہ کی طرف متوجہ کرتا ہے اور کہتا ہے۔

کس کا شکوہ کروں مجھے یہ بتاؤ   آپ منجدھار میں ڈوبی ناؤ
علم حاصل کرو ہنر سیکھو   فن تحصیلِ مال و زر سیکھو

شاعر اسی ضمن میں پھر زوال کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے۔

جب پھرے منہ شریعت سے   کٹ کے معبود کی اطاعت سے
سب پہ ایک سخت آگیا ادبار   مبتلائے بلا ہیں لیل و نہار
علم و حرفت کا انہیں نام نہیں   خیر و خوبی کا کوئی کام نہیں

اگر ادب و زندگی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ادب ہماری زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے اس سے ہماری قدریں متعین ہوتی ہیں اس سے انسانی جوہر ظاہر ہوتے ہیں۔ یہی ہمارے معاشرے پر اثر انداز ہوتا ہے تو مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ اس مثنوی میں شاعر ان تمام کمزوریوں کا اظہار بھی کرتا ہے جو ہمارے معاشرے کو گھن کی طرح لگ

گئی تھیں جس نے لوگوں کو خود غرض بنا دیا تھا۔ اور ہمدردی نام کو نہ رہی تھی۔ اگر میرا خیال صحیح ہے تو میں کہنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ انقلاب کے بعد اس قسم کی چیزوں کا آنا تاریخی حالات سے ثابت ہے۔ غدر اور طوائف الملوکی کے زمانہ کے بعد انسان دوسروں کی دیکھا دیکھی خود غرض ہوتا جاتا ہے جیسا کہ ہم اس زمانہ میں خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ ادبار و نحبت کے زمانے میں ہمدردیاں غائب ہو جاتی ہیں۔ مثنوی میں اس قسم کے اظہار اکثر ملتے ہیں۔

ایک کھاتا ہے پیٹ بھرتا ہے — دوسرا پاس بھوکا مرتا ہے

مثنوی میں بعض ایسے واقعات کا اظہار بھی ملتا ہے جن چیزوں کو لوگوں نے بطور لازم اختیار کر لیا تھا اور اس کے بُرے اثرات کی طرف اُن کی توجہ کم تھی۔ موصوف چونکہ کافی عرصہ حیدر آباد دکن میں مقیم رہے تھے اس لئے اس چیز کو خاص طور سے ذکر کیا۔

اب تو سیندھی شراب عیب نہیں

سادگیٔ بیان اور روزمرہ کا استعمال اس مثنوی کی خصوصیت ہے۔ میں سمجھتا ہوں یہ اثر دہلی کی وجہ سے ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

خاک اب رہ گئی مسلمانی — سر سے اونچا تو ہو گیا پانی
چرخ نے ایسے تفرقے ڈالے — سب کو جانوں کے پڑ گئے لالے

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اس زمانہ میں شاعر کو اپنی قومی صنعت کے ضائع ہونے کا افسوس ہے اور وہ استعمال اشیائے ملکی پر بہت زور دیتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس سے ملک آباد و شاد رہے گا۔ کوئی عسرت کا شاکی نہ ہوگا۔ اور سب خوشحال ہوں گے۔ شاعر کی نظر میں وہ تمام چیزیں ہیں جو یہاں تیار ہوتی ہیں اس کے باوجود لوگوں کی توجہ

باقی نہیں۔ اس کے خیال میں ملک کے زوال کا باعث ملکی اشیاء کا عدم استعمال ہے کہ

کونسی چیز یہاں نہیں موجود؟ — کون سا مال ہو گیا مفقود؟
میں نہ زنہار غیر ملک کی چیز — چاہیئے اپنی نیک و بد میں تمیز
اس میں پوری جو کامیابی ہو — ہر طرف قوم کی خرابی ہو

تنزل کے دور میں جو اخلاقی کمزوریاں بڑھتے بڑھتے عیب کی شکل اختیار کر لیتی ہیں اور جن فضول کاموں میں وقت ضائع ہوتا ہے شاعر ان باتوں کی طرف لطیف چوٹیں کرتا ہے۔ اور نہایت واضح الفاظ میں ان تمام کمزوریوں کا اظہار کرتا ہے جو اس زمانہ کے زوال پذیر دور کی یادگار باتیں تھیں ؎

کہیں شغلِ پتنگ بازی ہے — کہیں بیہودہ کار سازی ہے
کہیں طبلہ پر تھاپ پڑتی ہے — کہیں غرفہ میں آنکھ لڑتی ہے
کہیں ڈھولک ستار کی آواز — کہیں دلکش ہے نغمۂ دمساز
اس پہ شکوہ ہے تنگ دستی کا — شور ہے ان کی فاقہ مستی کا
واہ کیا خوب ہے لیاقت وا — مرحبا آفریں جزاک اللہ

۲۔ معاشرے کی حالت کا نقشہ پرانے جاگیردارانہ نظام کے زیرِ اثر جو خرابیاں ہمارے معاشرہ پر داخل ہو گئی تھیں اور جو اب بھی باقی ہیں۔ ان کو اس مثنوی میں بہت واضح طور سے بیان کیا گیا ہے مثلاً شادی بیاہ کے موقعہ پر خاندان اور برادری میں نام پیدا کرنے کے لئے قرض لینا ایک اس لینا ایک خاص طریقۂ کار تھا اور اس سے جو بُرے اثرات گھر کے دوسرے افراد پر بھی پڑتے ہیں اور اس سے جو تباہی مستقلاً خاندان پر آتی ہے اسکو خوب

بیان کیا ہے

شادیوں میں ہے بدعت و اسراف — مفلس و قرضدار ہیں اشراف
کوئی گھر بیچ دے رہن کرتا ہے — کوئی فاقوں کے مارے مرتا ہے
قوم کو بس ہے ہر طرح ادبار — کیوں نہ ہو ہے یہ خوبیِ کردار

افراد کے بگڑنے سے قوم کس طرح بگڑتی ہے اس طرح شاعر نے طنز کے لطیف پیرایہ میں خوب بیان کیا ہے۔ آگے چل کر کہتے ہیں ؎

در حقیقت تو یہ نہیں شادی — ہے حقیقت میں خانہ بربادی

معاشرتِ نسواں

حالی اس زمانہ میں ہوتے تو معلوم نہیں معاشرتِ نسواں پر کیا کیا چوٹیں کرتے۔ لیکن وہ تو اس قدر حساس ہیں کہ ان کے نزدیک ہوا خوری بے حیائی کے مرادف ہے۔ اس میں شک نہیں کہ عام گھروں میں معمولی معمولی باتوں پر جو خانگی تنازعات بڑھ کر جھگڑے کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ وہ گھروں میں رنج و غم کی گھٹاؤں کا پیش خیمہ ہوتے ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ حالی دستورِ تعلیم، نامناسب تربیت کو اس کی بنیاد قرار دیتے ہیں ؎

ڈھیلی چھوڑی گئی ہے جو ڈوری — روز ہوتی ہے اب ہوا خوری
دورِ تعلیم سے ہوا یہ حال — شوہروں کے ہے جنگ و جدال
بیوی بد خو میاں ہیں خشمگین — راحت اسکو کبھی نہ اس کو چین

اولاد کی طرف سے تعلیم میں عدم توجہی

حالی اولاد کی تعلیم کی طرف سے والدین کی عدم توجہی کی خاص طور سے شکایت کرتے ہیں وہ اخلاق تعلیم سے زیادہ ضروری سمجھتے ہیں جس کے لئے ع

قرآن پاک سے بہتر کوئی کتاب نہیں

لیکن اس کے ساتھ وہ انگریزی تربیت سے سخت ناراض ہیں اور اس پر خوب لے دے کرتے ہیں۔ یہ ہماری غلط تربیت کا نتیجہ ہی ہے کہ ہم زبان کو بحیثیت زبان اختیار نہیں کرتے، بلکہ انگریزیت کا لبادہ پہن کر اپنے کو مغربی قوموں کے شانہ بشانہ کھڑے ہونے کی تمنائیں دل میں لئے رہتے ہیں اور اس کے لئے وہی مثال صادق آتی ہے :۔

"کوا چلا ہنس کی چال، اپنی چال بھی بھول گیا"

حالی اپنے الفاظ اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

بس یہی شغل صبح و شام رہا — ایک مدت تک اہتمام رہا
وہی وضع و لباس اور کردار — وہی رفتار اور وہی گفتار
سب لوازم بھی ہو گئے جاری — ہو گیا پھر تو شغلِ مے خواری
زر ہے کاروبار کے قابل — ہوش گم عقل ہو گئی زائل
کچھ بزرگوں کا احترام نہیں — غیر کیا باپ کو سلام نہیں

ہم نے اپنی ظاہری آرائش کو اپنے کردار و اطوار کو چھپانے کے لئے جو ضروری قرار دے رکھا ہے اور اس ٹیپ ٹاپ سے جو نقصانات پہنچتے ہیں حالی اس کو ظاہر کئے بغیر نہیں رہتے۔

زینت و زیب ظاہری ہے ضرور — گرچہ اس مرتبہ نہ ہو مقدور
بنگلہ آراستہ ہو روح افزا — باغ تر سبز خوشنما زیبا

وہی قرض کا پرانا حربہ استعمال کرتے ہیں اور خان صاحب کے تقاضے اپنے اثر دکھاتے ہیں۔ دوسروں کے سامنے ظاہر ہوتے ہیں ؎

خوب ہے خرچ جس قدر ہو سوا — قرض بھی ہو تو کچھ نہیں پروا
قرض خواہوں کا جب ہجوم ہوا — بد مزاج اُن سے نفس شوم ہوا
پھر تو ہوتی ہیں بگھیاں نیلام — گھوڑے بکتے ہیں یہ ہوا انجام
کیا سعید و رشید ہے اولاد — ہے عدالت میں باپ پر فریاد

حالی مرحوم نے اس عنوان میں طنز کے بے پناہ حربوں سے نشتر کا کام لیا ہے اور اس چابک دستی سے کام لیتے ہیں کہ باغیرت کے لئے گھاؤ گہرا پڑے۔ وہ لوگوں کی اس نفسیات سے خوب واقف ہیں کہ عام آدمی کسی چالاک کو کیا سمجھتے ہیں۔ عوام کی نگاہ میں چالاک ہونا۔ ہر راہ سے گذرنا ہر قسم کی ذلت سہہ کر اپنی مطلب براری کرنا ہی ہوشیاری کی علامت ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ آج ہمارا ماحول بالکل ویسا ہی ہو گیا ہے جیسا کہ اس جنگ آزادی کے بعد اُس وقت شکست کے سبب، اِس وقت نشہ و بدمستی کے باعث، نتائج ایک ہی ہیں۔ گو اسباب مختلف تھے۔

آج ہم نے آرائش و زیبائش کو جو عزت کا سبب سمجھ رکھا ہے وہی دراصل ہماری خام تربیت کا اثر ہے ؎

لوگ کس درجہ ہو گئے بیباک — وہی ہشیار ہے جو ہو گئے چالاک
کوئی کیسا ہی ہو ہنر پرور — عالم و کامل و زبان آور
گر نہ ہو یہ نیا لباس پسند — ہو نہ وضعِ جدید کا پابند
ہمسروں میں اگرچہ ہو فائق — پر ہے وہ انتہا کا نالائق
سب کی نظروں میں ہو ذلیل و حقیر — کون سنتا ہے التماسِ فقیر

حالی مرحوم انگریزی تعلیم کے مخالف نہیں معلوم ہوتے بلکہ اس کے غلط اثرات

کے ان کو وہ ضرور بیان کرتے ہیں ؎

انگریزی پڑھے نہال ہوئے — عہدہ پایا تو ذی کمال ہوئے
ب کیا خوب ہے زباں دانی — پر جو باقی رہے مسلمانی!

و ملنے جلنے کے مخالف ہیں نہ ارتباط بڑھانے کے خلاف ہیں لیکن ہم نے عقائد مسلمہ اور عادات کو ترک کر کے یہ جدید راستہ اختیار کیا۔ اس کے خلاف کیا ضرور ہے کہ ہم زبان سیکھتے سیکھتے خود اپنے اصولوں کو ترک کر دیں ؎

ب سے ملنا ہو اختلاط رہے — ہو ملاقات ارتباط رہے
ول اخلاق ہو مروّت ہو — مذہبِ دینِ حق کو قوت ہو

ایک خاص چیز جو اس مثنوی میں ہے کہ مصنف بعض بعض جگہ مشکل الفاظ کرتا ہے اور عربی الفاظ کا استعمال بہت بے تکلفی سے کیا ہے ؎

کرتا ہے اس پہ عقلِ سلیم — ہے بُرا اتباعِ نفسِ لئیم

ایک آدھ جگہ عربی کے اشعار بھی ہیں۔ بعض جگہ آدھے مصرعے عربی کے ہیں اور خلاف اس طرح استعمال کیا ہے جو نہایت موزوں و مناسب معلوم ہوتا ہے۔
الفاظ جیسے منتبہ۔ وعظ غیر متعظ۔

آخری اشعار میں اصول دین اور نماز و روزہ، حج و زکوٰۃ کی ادائیگی کا ذکر کیا گیا ہے اور ان میں سے ہر اک کا الگ الگ بیان ہے۔ مکہ معظمہ شاعر اسی طنز کے طریقہ کو اختیار کرتا ہے جس سے کہ ٹیس دل میں پیدا ؎

اٹلی سوئس لندن کو — آسٹریا، فرانس، جرمن کو

مصر جائیں گے شام جائیں گے — پر نہ مکّہ کی راہ آئیں گے
حج کو جائیں تو کیا قباحت ہے — شغل امیروں کا اب سیاحت ہے
یہاں سیاحت ہے اور طاعت ہے — اور جا تو فقط سیاحت ہے

زیارت مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ سے جو روحانیت و تقویت روح و ایمان
ہوتی ہے اس کو شاعر بھی نظر انداز نہیں کرتا۔ شعراء کی ہر تڑپ شاعرانہ نہیں بلکہ
میں پہونچنے والوں کے دل سے پوچھے کہ کیا علاج؟ اقبال کے کلام سے پوچھئے کہ کر
سفر ہے۔

آج بین الاقوامی طرز پر کانفرنس بلائے جانے کی جو تجاویز زیر نظر ہیں ا
نزدیک یہی مقصد خاص تھا کہ ہر خطۂ ملک کے لوگ اس طرح مل لیں کہ ایک دو
کے خیالات سے واقف ہو جائیں اور ایک دوسرے کے مسائل سمجھ سکیں ؎

بہر حج مکّہ کو اگر جائیں — سیکڑوں فائدے وہاں پائیں
لوگ کہتے ہیں ملک ملک کے وہاں — ملتے ہیں صنف صنف کے انسان

سب ترقی کی طرف مائل ہوں:۔

ہو ملاقات پختہ کاروں سے — عقلمندوں سے ہوشیاروں سے
سب مسلمان بنیں سب نماز گزار
سب خدا ترس سب ہی تجربہ کار

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ

بعونِ ایزد ستان دریں زمان سعادت اقتران مثنوی جامع انواع......

سرّ الحکمت سنہ ۱۳۰۷ ھجری

از تصانیف

فاضل علام عالم قمقام حضرت السید احمد حسن البرکتی الواسطی ادام فضلہ العلی الاعلی
اکرم الشہی

در مطبع اخبار آصفی باہتمام سید محمد حمید دہلوی طبع گردید

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لب پہ حمد جناب باری ہے — شکر نعمت زبان پہ جاری ہے
حمد ثابت ہے خدا کے لئے — شکر ہے ذات کبریا کے لئے
خالق الخلق باری النسم — مالک الملک واہب النعم
سارے عالم کا کارساز ہے وہ — کل کا رازق ہے بے نیاز ہے وہ
حکمت خاص ہے خدا کے لئے — کبریائی ہے کبریا کے لئے
کی نہیں یہاں فروتنی کس نے — گر گیا وہ اٹھایا سر جس نے
خاکساری سے ہے مرتبہ بلند — ہے یہاں عجز و انکسار پسند
کبر و نخوت سے خوش نہیں معبود — دم میں ابلیس ہو گیا مردود
آسمان و زمین و لیل و نہار — قدرت کاملہ کے ہیں آثار
قائم اس کی بقا پہ ہے برہان — ماسوا کل من علیہا فان
عالم و قادر و سمیع و بصیر — صادق و مدرک و علیم و قدیر
کوہ کو لالہ فام سنگ دے — ایک گل کو ہزار رنگ دے
لے نہ ہے شان قدرت باری — کی ہے پتوں پہ کیسی گلکاری
عقل انسان کو عنایت کی — اس نے توفیق دی ہدایت کی

در نعت

انبیا ہیں چراغ راہ نجات — بحر ذخار رحمت و خیرات
اصفیائے خدائے سرور ہیں — خاتم الانبیاء محمدؐ ہیں

اشرف المرسلین امام ورا — محرم سر حق شہ دوسرا
تھے عرب حیرت ضلالت میں — ظلمت نخوت و جہالت میں
خالق کل مانتے ہی نہ تھے — اپنے مالک کو جانتے ہی نہ تھے
خانۂ حق بتوں سے تھا معمور — منزلوں راہ راست سے تھے دور
برسوں سمجھایا سعی فرمائی — حق و باطل کی راہ دکھلائی
لائے خالق کے پاس سے قرآن — فصحا سن کے ہو گئے حیران.
مل کے ہر چند سعی و کوشش کی — ایک سورہ نہ لا سکا کوئی
حجت اللہ ابلغ البلغاء — آیت اللہ افصح الفصحاء
مدتوں دین حق کی دعوت کی — حکم سے ہوئی اشاعت کی!
بھر گیا تھا دلوں میں بغض رسول — آئے پر خاش پر عرب کی جھول
پھر تو اسلام کی کھنچی شمشیر — تھوڑی مدت میں کر لیا تسخیر
نقش ہے دل پہ شرق سے تا غرب — خیبر و خندق و احد کی حرب
اس پہ اور ان کی آل پہ ہو سلام — اور اصحاب پر درود و سلام

التجا بدرگاہ خدائے تعالیٰ

تیری رحمت وسیع ہے یارب — مبتلائے گناہ ہیں ہم سب
عفو کر غافر الذنوب ہے تو — رحم کر ستار العیوب ہے تو
بخشیے ہم گنہگاروں کو — عاصیوں کو سیاہ کاروں کو
اپنی رحمت عفو عصیان کر — مشکل مرگ و قبر آسان کر

ساتھ کچھ بجز گناہ نہیں
بہ رحم فرما کہ زاد راہ نہیں

زندگی بھر کبھی نہ دھیان آیا
نفس خیرہ کبھی نہ شرمایا

معصیت میں کٹی ہے ساری عمر
رائیگاں ہی گئی ہماری عمر

نہ کیا کار خیر ایک نفس
نہ گئے قلب سے ہوا و ہوس

اپنے حق میں بڑا کیا ہم نے
وائے غفلت یہ کیا کیا ہم نے

اے دل اب کر تضرع و زاری
تاکہ نازل ہو رحمت باری

تو ہے یا رب مسبب الاسباب
کھول دے ہم پہ خیر کے ابواب

نفس بد سے بچا حمایت کر
ہم کو توفیق دے ہدایت کر

دل ترے ڈر سے دردناک رہے
سینہ بغض و حسد سے پاک رہے

چشم ہر وقت اشکبار رہے!
تن میں بے چین جان زار رہے

دل پُر درد دیدہ تر دے
تیرا سودا ہو جس میں وہ سر دے

سینہ پُر نور علم سے کر دے
ہر رگ و پے میں معرفت بھر دے

بطفیل رسول و آل رسول
یہ دعا عاصیوں کی ہو مقبول

بارالہا زباں میں دے تاثیر
ہر دلوں پہ اثر دے تقریر

ہو مؤثر یہ سب نصیحت و پند
ہر جگہ خاص و عام کو ہو پسند

سب کا اس پر عمل رہے دن رات
ساتھ سب کے ملے مجھے بھی نجات

معذرت

سب کی خدمت میں التماس ہے یہ
کتب دیں سے اقتباس ہے یہ

[illegible]ائی مضمون کسی پہ بار نہ ہو
حق پسندوں کو ناگوار نہ ہو

[illegible] یہ سب مقتضائے دلسوزی
کہ غرض ہے سعادت اندوزی

[illegible] حقیقت میں ہو بجا بے جا
اس کے اظہار میں تامل کیا

صاحبان بصیرت حق و بین
اسکو دیکھیں درست ہے کہ نہیں

[illegible] ہے کہ انصاف اسکا مطلوب
ہو دوکان کوئی بھی متاع ہو خوب

[illegible] کریں سے چشم پوشی ہو
اعتراضات سے خموشی ہو

[illegible] ہوئی ہو غفلت انساں سے
کہ مرتکب ہو سہو و نسیان سے

ہو تا[illegible] سید لولاک
ہو تخلق بہ خلق ایزد پاک

[illegible]سول اور یہی مامول
رکھ کے منت کریں یہ عذر قبول

در بیان ترقی اسلام

[illegible] حالات نظم کرتا ہوں
درد سے آہ سرد بھرتا ہوں

[illegible] جو کہتا ہوں اسکو سچ جانو
گوش دل سے سنو مسلمانو

سب کو لازم ہے دین کا استحکام
چاہیئے کچھ حمیت اسلام

[illegible] کیوں ہو اب تو ہوشیار
خواب غفلت سے جلد ہو بیدار

[illegible] حالات اپنے یاد کرو
دل میں مضبوط اعتقاد کرو

[illegible] ایک حکم شرع جاری تھا
خوش تھے سب لوگ فضل باری تھا

[illegible] تھی حکومت اسلام
روز افزوں تھی قوت اسلام!

[illegible] تھا بلند شام و پگاہ
نعرہ لا الہ الا اللہ!

سب پہ افضال حق تعالیٰ تھا — دین احمد کا بول بالا تھا
ہر جگہ دین کی اشاعت تھی — رونق جمعہ و جماعت تھی
بہر دین جوش جاں نثاری تھا — اک مسلماں سو پہ بھاری تھا
علما سے بھرے تھے شہر و بلاد — مدرسے تھے علوم سے آباد
مسجدوں میں وہ قرأت و ترتیل — وہ اقیموا الصلوٰۃ کی تعمیل
وہ نمازی وہ شرع کے پابند — انکے افعال تھے خدا کو پسند
فقرا پر تھا اغنیا کا کرم — جادۂ خیر سے ڈگا نہ قدم
رات دن تھی اطاعت معبود — تھی رضا جوئی خدا مقصود
سالک مسلک شریعت تھے — رہرو جادۂ اطاعت تھے
چست و چالاک تھے بہادر تھے — اسد بیشۂ تہوّر تھے
وہ خدائے کریم کی تائید — اور وہ کوشش رسول مجید
تھا زبردست لشکر اسلام — سر اٹھاتا نہ تھا کوئی خودکام
سرکشوں نے قبول دعوت کی — عجز ظاہر کیا اطاعت کی
خوف غالب تھا کج کلاہوں پر — چھا گیا رعب پادشاہوں پر
پہلوان آ کے سامنے ہارے — دل لرزتے تھے خوف کے مارے
جب لڑے کھائی مشرکوں نے شکست — لائے اسلام آفتاب پرست
پڑھتے تھے آ کے مشرک و گمراہ — کلمۂ لا الٰہ الا اللہ
مرد و زن جوق جوق آتے تھے — کلمہ پڑھ پڑھ کے فیض پاتے تھے
تھوڑی مدت میں سب شباب ہوئے — دولت دین سے کامیاب ہوئے

دین کی راہ ہو گئی روشن — جل گئے کفر و شرک کے خرمن!
دیکھ کر معجز کتاب اللہ — آ گئے راہ راست پر گمراہ
فصحا نے فصاحت قرآں — مان لی دل سے لائے سب ایماں
توڑ ڈالا بتوں کو خوب کیا — سجدۂ غافر الذنوب کیا
شہرت اسلام کی ہوئی ہر جا — شام و مصر و یمن حلب بطحا!
آتش گیر ہو گئی خاموش — روم و ایران کے ہو گئے گم ہوش
بتکدے سینکڑوں خراب ہوئے — مشرکین حاضر رکاب ہوئے
بہرہ ور شیخ و شاب ہوتے تھے — دین سے کامیاب ہوتے تھے
ہو گیا ہر گروہ دانش مند — حج و صوم و صلوٰۃ کا پابند
[illegible] خالق العباد ہوا — حق پرستوں میں اتحاد ہوا
[illegible] ہو گئے مقصود! — بدعت و ظلم کا رہا نہ وجود
ہو گئے لوگ فضل حق سے نہال — دولت دین سے تھے مالا مال
[illegible] سب وضیع و شریف — عبد و آزاد کیا قوی و ضعیف
علم اخلاق اور [illegible] ادب! — سیکھ کر ہو گئے مہذب سب
[illegible] نماز گزار — عابد و متقی و شب بیدار
[illegible] عدل و داد ہوا — یک قلم برطرف فساد ہوا
[illegible] مشرکوں کا استیصال — آ گیا کفر و زندقہ پہ زوال
[illegible] عبادات ہوئے — رہرو جادۂ نجات ہوئے
[illegible] وخوش باش — منکر نفس خندہ رو بشاش

ہنر و علم ہو گیا مفقود باب خیرات ہو گیا مسدود
جانتے ہیں یہ سب صغار و کبار سو میں دو بھی نہیں نماز گزار
ترکِ پابندی شریعت کی چھوڑ دی راہ دین و ملت کی
اب کہاں روزہ و نماز و زکات کٹتی ہے لہو و لغو میں اوقات
متواتر ہے اب نزولِ بلا حبسِ باراں ہمیشہ قحط و وبا
جا بجا ہے زیادہ فسق و فجور رحم فرمائے سب پہ ربِ غفور
بڑھ گئی آفت و پریشانی اب تو ہو توبہ و پشیمانی
کثرت اب ہے سیاہ کاری کی ہے ترقی شراب خواری کی
مسجدیں ہیں پڑی ہوئی سنسان نظر آتا نہیں کوئی انسان
قیدِ سن شباب و شیب نہیں اب تو سیندھی شراب عیب نہیں
فرض ہے حسب قولِ ربِ رؤف نہی منکر و امر بالمعروف
بھائیو بہنوں کو چیت کرو اپنے افعال کو درست کرو
خوابِ غفلت سے اب تو ہو ہشیار چاہیئے راہ نیک کی رفتار
اہلِ اسلام پہ تباہی ہے دو جہاں کی یہ رو سیاہی ہے
ہنر و کسب و اکتساب نہیں عملِ بد سے اجتناب نہیں
بے کمالی سے ہو گئے تاراج بزدل، آوارہ، مسرف و محتاج
خود سری نے فقط انہیں مارا ہیں یہ محکوم نفسِ آمارہ
عقل کی ان میں کوئی بات نہیں ضمیر کی جانب التفات نہیں
غیرت و شرم و ننگ و عار نہیں نفسِ خیرہ پہ اختیار نہیں

قابلیت نہیں کمال نہیں بے کمالی پہ انفعال نہیں
کچھ ہے گر تو ہے خیال یہی زندگانی کا ہے مآل یہی
چار پیسے جو ہاتھ میں آئیں خوب اڑائیں انہیں پئیں کھائیں
اس لئے وقعت و وقار نہیں غیر قوموں میں اعتبار نہیں
بگڑے سب کار و بار دیکھ چکے اپنا انجام کار دیکھ چکے
کوئی باقی نہیں رہی ذلت خوب جھیلی مصیبت و عسرت
مفت میں ملک و مال کھو بیٹھے دین و دنیا سے ہاتھ دھو بیٹھے
کیوں گھروں میں نکمے بیٹھے ہو چاہیئے آپ اپنی قدر کرو
ایسا کرتا ہے کیا بھلا کوئی ۔ سلطنت اپنے ہاتھ سے کھوئی
تم تو اشراف خاندانی ہو کن بزرگوں کی تم نشانی ہو
کس کا شکوہ کروں تمہیں یہ بتاؤ آپ مجدھار میں ڈبوئی ناؤ
علم حاصل کرو ہنر سیکھو فن تحصیل مال و زر سیکھو
قوم کا باہم اتفاق رہے ہر مسلمان چست و چاق رہے
تا کہ عزت اعتبار بڑھے ہو فزوں دولت اقتدار بڑھے
مارو تم اپنا نفس آمارا شیر مارا تو تم نے کیا مارا
کارسازی میں اہتمام رہے وہ کرو کام جس سے نام رہے
کس لئے کام کرتے ہو بیکار کس لئے ہے ہمیشہ سیر و شکار
سب کو لازم ہے کہ یہ چست رہیں تا کہ دین و دنیا درست رہیں
شوق کسب و کمال ہو دن رات چاہیئے کچھ تلافی ما فات

ہر کہ وہ مہ پر ہو گیا حالی | جہل ہے علتِ بداعمالی
بس اسی سے ہے عسرت و افلاس | چار پیسے نہیں کسی کے پاس
علم و فنِ الٰہی و شرع چھوڑ دیا | راستبازی کا رشتہ توڑ دیا
جب سے پھر اپنے ہیں شریعت سے | گل کے معبود کی اطاعت سے
سب پہ اک نحت آ گیا ادبار | مبتلائے بلا ہیں لیل و نہار
علم و حرفت کا ان میں نام نہیں | خیر و خوبی کا کوئی کام نہیں

دربیانِ ترقیِ نصاریٰ و ترغیبِ اہلِ اسلام

دیکھو انصاف سے نصاریٰ کو | کچھ تو شرماؤ فکر و غور کرو
کس قدر کی ترقیِ دولت | کیسی ہے شان و شوکت و حشمت
کیا بھلا سلطنت یونہیں پائی | گھر میں بیٹھے بٹھائے ہاتھ آئی
کہاں ہندوستان کہاں لندن | کتنی دور آ کے یہاں کیا مسکن
کیسی کیسی نہ جاں فشانی کی | عقل و حکمت سے حکمرانی کی
ملک میں ان کا حکم جاری ہے | رات دن حزم و ہوشیاری ہے
تم بھی علم و کمال و فن سیکھو | جیسے وہ آدمی ہیں تم بھی ہو
جملہ اقسام کی تجارت ہو | کثرتِ دولت و امارت ہو
صنعتیں ہوں نئی نئی ایجاد | متمول ہوں لوگ ملک آباد
مدرسے جابجا مقرر ہوں | ملک کے لوگ سب ہنرور ہوں
خوب تعلیم ہو ہر اک فن کی | ملک بن جائے شکل لندن کی

مجلسِ مشورت بنائی جائے | تا ہر اک از خوبیٔ رونق پائے
ہوں سب ارکان زیرک و ہشیار | اہلِ فضل و کمال و تجربہ کار
اہلِ صنعت کی قدردانی ہو | گرچہ کاریگری پرانی ہو
اس سے ہمت بلند ہوتی ہے | آگے رونق دوچند ہوتی ہے

دربیانِ استعمالِ اشیائے ملکی

ملکی اشیا کا ہو جو استعمال | پھر کبھی ملک پر نہ آئے زوال
یہاں کی ہر شے کی ہو خریداری | منقطع ہو ہر اک بیوپاری
نہیں ہرگز نہ ہو غیر ملک کی چیز | چاہیے اپنی نیک و بد میں تمیز
ہو جو بالالتزام پابندی | پھر تو ہو شہرت و خردمندی
اس میں پوری جو کامیابی ہو | ہر طرف قوم کی فراوانی ہو
[illegible] اس کو دیدہ و رو دیکھیں | چشمِ حق بیں سے اک نظر دیکھیں
اہل ہمت کو کچھ نہیں دشوار | ہمتِ اہلِ دول کی ہے درکار
کون سی چیز یہاں نہیں موجود | کون سا مال ہو گیا مفقود
ہو دو شالہ۔ اطلس و مخمل | تاش، کمخواب، بافتہ، ململ
ہو کرسی پلنگ، چوکی، تخت | ہر طرح کے ہیں جنگلوں میں درخت
اور اشیا کے جتنے ہیں انواع | اکثر اقسام کے ہیں یہاں صناع
اسی انداز میں ہے امیدِ فلاح | رہیں حکام درپئے اصلاح
[illegible] دل و جان سے یہ کام رہے | ایک مدت تلک اہتمام رہے

چند اشخاص اس میں ہیں درکار
معتبر، شریف، تجربہ کار

والیٔ ملک کی حمایت ہو
امراء کی بھی کچھ عنایت ہو

طیب خاطر سے سب کو ہو منظور
ہوں حضر و سفر جا بجا مامور

اہلِ صنعت کو خوب ہو ترغیب
تا ہو ہر ایک امر کی تہذیب

رہے پابندیٔ شریعت بھی
ہو بجا آوریٔ طاعت بھی

تا ترقی ہو دین و دنیا کی
پھر نہ عسرت کا کوئی ہو شاکی

عیش و راحت میں زندگانی ہو
حق تعالیٰ کی مہربانی ہو

ہو ترقیٔ دولت و اقبال
اہلِ اسلام سب رہیں خوشحال

در بیان علاجِ بیماران

صحتِ جسم ہے مدارِ امور
ہو طبابت کا اہتمام ضرور

درس و تدریس طب کی ہو جاری
ہو بخوبی علاجِ بیماری

قدر ہو آزمودہ کاروں کی
عقلمندوں کی ہوشیاروں کی

مفردات اور دوا ہوں تازہ و نیک
ہو نہ آمیزشِ خس و خاشاک

کوئی بے امتحاں کرے نہ علاج
کہ نہ بگڑے کوئی صحیح مزاج

مذمتِ لہو و لعب

عادتِ اختلاط بیجا ہے
کارِ دنیا نہ کارِ عقبیٰ ہے

ہے ہنسی دل لگی مزاح کلام
محض بیکار صبح سے تا شام

پان حقہ کہیں، کہیں افیون
قہقہوں سے ہے گرم بزمِ جنوں

اک زمانہ کی ہوتی ہیں باتیں
یونہیں اکثر گذرتی ہیں راتیں

کہیں افسانہ و حکایت ہے
کہیں غیبت کہیں شکایت ہے

کہیں شغلِ پتنگ بازی ہے
کہیں بیہودہ کارسازی ہے

گرم ہیں پالیاں بٹیروں کی
جنگ ہے ہاتھیوں کی شیروں کی

چنڈو، بنٹو کا کوئی دیوانہ
کہیں آراستہ مدک خانہ

رنگ زہاد کے ہویدا ہیں
ملکوتی صفات پیدا ہیں

کہیں جلسہ ہے ناچ گانے کا
کہیں مردنگ کے بجانے کا

کہیں طبلہ پہ تھاپ پڑتی ہے
کہیں غرفہ میں آنکھ لڑتی ہے

کہیں ڈھولک ستار کی آواز
کہیں دلکش ہے نغمۂ دمساز

اک طرف واہ واہ کی ہے صدا
ایک طرف وجد میں ہے سر ہلتا

کہیں ملتی ہے داد سم سُر کی
کہیں آواز ہے تمسخر کی

اس پہ شکوہ ہے تنگ دستی کا
شور ہے ان کی فاقہ مستی کا

واہ کیا خوب ہے لیاقت واہ
مرحبا آفرین بارک اللہ

مذمتِ اسراف و بدعت

شادیوں میں ہے بدعت و اسراف
مفلس و قرضدار ہیں اشراف

کوئی گھر بیع و رہن کرتا ہے
کوئی فاقوں کے مارے مرتا ہے

قوم کا ہے ہر ایک طرح ادبار
کیوں نہ ہو یہ خوبیٔ کردار

خرچ کرتے ہوئے نہ کی پروا — بعد اسراف نے کیا رسوا
کیوں کرے کوئی ایسی نادانی — جس سے آخر کو ہو پشیمانی
اصل شادی ہے مہر و زن کا نکاح — اور سامانِ عیش ہو جو مباح
شادمانی سے جہیز و زیور و مال — حسبِ حیثیت و مناسبِ حال
جو ہے تقریب در اہیاتِ فضول — کیوں کرے پر خلافِ شرعِ رسول
دولت و مال جس قدر ہو زیاد — اہلِ حاجت کی اس سے ہو امداد
دو اگر ہے تو یہ ہے نفعِ عظیم — وہ خوشی دل کی یہ رضائے کریم
ورنہ عقلاً تو یہ نہیں شادی — ہے حقیقت میں خانہ بربادی
سب پہ ہے فرض امیر ہو کہ فقیر — اتباعِ رسول و ربِ قدیر
عمر بھر نفس کی اطاعت کی — طاعتِ حق نہ اک ساعت کی
کر کے دنیا میں چند روز بدی — کھوئی ہاتھوں سے راحتِ ابدی
لوحِ دل پر سدا رہے لکھا — قولِ خیر الامور اوسطہا

معاشرتِ نسواں

عورتوں کی معاشرت کا طریق — سخت بیجا ہے دے خدا توفیق
دست بردار ہیں شریعت سے — منحرف جادۂ اطاعت سے
حیرت انگیز ان کے سب حالات — معصیت خیز منشاء بدعات
طاعتِ نفس کا ہے یہاں دستور — شرع کے برخلاف جملہ امور
کیا بُرا ہو گیا ہے رسم و رواج — اہلِ اسلام کے ہوئے تاراج

فوت ہو جائے طاعتِ باری — پر رہے رسمِ معصیت جاری
خوفِ دوزخ نہ شوقِ باغِ جناں — ہے جدا سب سے مذہبِ نسواں
نہیں پروائے شرعِ خیر انام — ہیں تباہ محاسنِ اسلام
پیروی نفس کی ہے شام و سحر — ہے بڑا عیب اطاعتِ شوہر
[illegible] جائز ہے ہر جگہ سامان — بڑھ گئی حد سے جرأتِ نسواں
[illegible] تھوڑی گئی ہے جو ڑ دوری — روز ہوتی ہے اب ہوا خوری
اب تو شرم و حیا کا کام نہیں — پردہ داری کا اہتمام نہیں
سوءِ تعلیم سے ہوا یہ حال — شوہروں سے ہے جنگ و جدال
[illegible] ہے بد زبانی ہے — اک مصیبت میں زندگانی ہے
[illegible] جانب سے ہے فساد بپا — گفتگو ہے زبان پہ نازیبا
[illegible] لذتِ آرام — ہر دم آزردگی ہے ہیں بدنام
[illegible] پریشاں کو ہے جانا — نہیں ملتا ہے وقت پر کھانا
[illegible] خوش ہے وہ دل افسردہ — نا رضامند یہ، وہ آزردہ

سوءِ تعلیمِ اولاد

ہو گئی ترک راہ و رسمِ قدیم — کیا بُرا ہے طریقۂ تعلیم
[illegible] نہ کبھی رہ صلاح و رشاد — بد سے بدتر نہ کیوں ہو پھر اولاد
[illegible] دین کی وہ دلسوزی — اُٹھ گئی ہے عقائد آموزی
[illegible] ہو گئی جب اُنکی خراب — پھر خطا میں کہاں امیدِ صواب

نہ سکھائے اصولِ دیں میں اصلا
نہ دکھائی رہِ رضائے خدا

نہ پڑھائی گئی خدا کی کتاب
نہ بتائے محاسنِ آداب

انگریزی کا زبان جو کی شروع
ہوگئے ترک سب اصول و فروع

بچپنے سے یہی رہی تعلیم
ہوگیا خوگر اس کا نفسِ لئیم

بس یہی شغل صبح و شام رہا
ایک مدت تک اہتمام رہا

وہی وضع و لباس و کردار
وہی رفتار اور وہی گفتار

ہوگئے رفتہ رفتہ پھر عادی
ہوگئی دینِ حق کی بربادی

سب لوازم بھی ہوگئے جاری
ہوگیا پھر تو شغلِ مے خواری

دین تو پہلے ہی ہوچکا تھا تباہ
گئی دنیا بھی اب خدا کی پناہ

نہ رہے کاروبار کے قابل
ہوش گم عقل ہوگئی زائل

یہی تعلیمِ بد کا ہے انجام
کھو کے دنیا و دیں ہوئے بدنام

اکثر اشخاص آج ہیں موجود
ہیں جہالت سے منکرِ معبود

کچھ بزرگوں کا احترام نہیں
غیر کیا باپ کو سلام نہیں

خوب تہذیب نفسِ شوم ہوئی
واہ کیا رونقِ علوم ہوئی

سوءِ تعلیم کی ہے یہ تاثیر
کہ بھی غیر قوم کی تصویر

[illegible] تہذیبِ نفس لاف و گزاف
سوءِ خلق و بطالت و اسراف

زینت و زیبِ ظاہری ہے ضرور
گرچہ اُس مرتبہ نہ ہو مقدور

[illegible] آراستہ ہو روح افزا
باغ سرسبز خوشنما زیبا

[illegible] گسترده ہو دلربا رنگین
گھوڑے شائستہ سربلند حسین

[illegible] ہے خرچ جس قدر ہو ہوا
قرض بھی ہو تو کچھ نہیں پروا

[illegible] خواہوں کا جب ہجوم ہوا
بدمزاج اُن سے نفسِ شوم ہوا

[illegible] ہوتی ہیں بگیاں نیلام
گھوڑے بکتے ہیں یہ ہوا انجام

[illegible] رشید ہے اولاد
ہے عدالت میں باپ پر فریاد

[illegible] خوب ہوتا ہے
ارتکابِ ذنوب ہوتا ہے

[illegible] میں مسرف آوارہ
باپ تکلیف میں ہے بیچارہ

[illegible] باپ بھائی یہ سلوک
دیکھیں اِن راہ و راستی سے نہ چوک

[illegible] خیر خواہی ہے
فقر بہتر ہے بادشاہی سے

ترغیب تعلیم اولاد

[illegible] گروگار ہے اولاد
سب کو لازم ہے شکرِ ربِّ عباد

[illegible] وضع و لباس میں تغیر
ہر دم اصلاح کی رہے تدبیر

[illegible] احتراز رہے
ضابطہ روزہ و نماز رہے

[illegible] سے
متمتع ہو زندگانی سے

خوب حاصل ہو دولتِ تہذیب
ہو ضرورت تو چاہیے تادیب

دین و دنیا کی کامیابی ہو
ہر طرف جہل کی خرابی ہو

لکھنا پڑھنا سکھائیں بچوں کو
سعی تعلیم و تربیت میں ہو

سب سکھائیں قواعدِ اسلام
خوب ہوں یاد شرع کے احکام

اُن کو ڈالیں نماز کی عادت
دل سے دینِ خدا کی ہو رغبت

شوق و رغبت کا جمع ہو سامان
تا ہو مضبوط پایۂ ایمان

رہیں تحصیلِ علم میں مشغول
ہو سلوکِ رہِ خدا و رسول

نیک و بد میں سدا تمیز رہے
اپنے بیگانے کو عزیز رہیں

حسنِ تعلیم میں قصور نہ ہو
اعتقادات میں فتور نہ ہو

وجہ مشروع سے ہو کسبِ معاش
نیک اعمال میں ہو سعی و تلاش

فعلِ واجب کا التزام رہے
خیر و خوبی میں اہتمام رہے

بعد تحصیلِ علمِ دین و رسول
کسبِ روزی کے بھی سکھائیں اصول

فنِ کسبِ معاش و فضل و کمال
ہنر اکتسابِ دولت و مال

سعی لازم ہے سب کو تا مقدور
صرفِ ہمت میں ہو کبھی نہ قصور

معاشرتِ ابنائے زمان

کیا زمانہ کا انقلاب ہوا
اب خطا کا لقب صواب ہوا

تنِ مہذب ہو دل پُر از وسواس
بُت کو پہنا دیں جیسے عمدہ لباس

لوگ کس درجہ ہو گئے بیباک
وہی ہشیار ہے جو ہے چالاک

اب طریقِ معاشرت ہے عجیب
کبر و نخوت ہے معنیٔ تہذیب

خود ستائی ہے خود پسندی ہے
مکر و تزویر عقلمندی ہے

کوئی کیسا ہی ہو ہنر پرور
عالم و کامل و زبان آور

چاہے دنیا کے ہوں کمال اس میں
ہوں پسندیدہ سب خصال اس میں

گر نہ ہو وہ نیا لباس پسند
ہو نہ وضعِ جدید کا پابند

کارروائی سے بہرہ یاب نہیں
بے ہنر و قابلِ خطاب نہیں

ہمسروں میں اگرچہ ہو فائق
پر ہے وہ انتہا کا نالائق

سب کی نظروں میں ہے ذلیل و حقیر
کون سنتا ہے التماسِ فقیر

بے امیدِ معاش ہیں ناکام
یہ ہے تحصیلِ علم کا انجام

جب ہو اہلِ علوم کا یہ حال
پھر کس امید پر ہو کسبِ کمال

جس نے کی اختیار وضعِ جدید
ہے وہ ہشیار و عقلمند و رشید

ہم نشیں قوم سے تنفر کی
ہے دماغوں میں بو تنفر کی

یہ عنایت ہے مہربانی ہے
واہ کیا خوب قدردانی ہے

مذمتِ تغیرِ وضع و لباس

تشبہ الغیرِ قوم نہ ہو
تلبس بلبس لوم نہ ہو

ہیں جہاں کے تمام دانشمند
اپنی وضع و لباس کے پابند

ترکی، پارسی و بنگالی
چینی و جاپانی و نیپالی

پھر ہم اپنا لباس کیوں چھوڑیں
کس لئے پھر ہم اس سے منہ موڑیں

کیا اسی میں ہے حصر عقل و کمال
کیا اسی سے ہے جاہ و دولت و مال

چاہیئے اس میں کچھ تامل و غور
عقل ہے اور شے لباس ہے اور

کیوں کرے کوئی اسکا استعمال
جس سے ہو کچھ ضلالت و اضلال

ہے عقیدوں میں اب ظلمت نور
جیسے زنگی کا نام ہو کافور

نفس کا تزکیہ ہو اور تہذیب
چاہیئے اس خبیث کی تادیب

دین و دنیا کی سب اسی میں فلاح
ہے معاش و معاد کی اصلاح

حکم کرتی ہے اس پہ عقل سلیم
ہے برا اتباع نفس لئیم

چاہیئے مستحق مدحت ہو
نہ کہ مستوجب مذمت ہو

کام جو ہو وہ عاقلانہ ہو
جس کا مداح اک زمانہ ہو

انگریزی پڑھے نہال ہوئے
پایا عہدہ تو ذی کمال ہوئے

عیب کیا خوب ہے زبان دانی
پر ہو باقی رہے مسلمانی

سست مذہب کا اعتقاد نہ ہو
صاف نیت رہے فساد نہ ہو

رہیں پابند فرض صوم و صلوۃ
حج کو جائیں کریں ادا زکوۃ

پیروی ہو نہ کچھ نصارا کی
ترک ہوں صحبتیں سکارا کی

سب سے ملنا ہو اختلاط رہے
ہو ملاقات ارتباط رہے

بدل اخلاق ہو مروت ہو
مذہب دین حق کو قوت ہو

فرض ہے یہ ہر اک مسلمان پر
کہ عمل ہو حدیث و قرآن پر

ہو رہے ہے یہاں کا استحکام
آخرت کا بھی چاہیئے کچھ کام

یہاں ہر اک شی کی حیات فانی ہے
چار دن کی یہ زندگانی ہے

آخر کار سب کو مرنا ہے
دہر سے ایک دن گزرنا ہے

آہ تنہائی اور وہ بار گناہ
وحشت قبر وہ معاذ اللہ

وہ اندھیرا وہ طول برزخ کا
سامنا وہ عذاب دوزخ کا

راہ پر خوف اور وہ اہوال
ساتھ کوئی نہیں بجز اعمال

فکر کر مرگ و قبر درپے ہے
تا خدائے کریم شاد رہے

حیف ہے بندہ بندگی نہ کرے
اپنے مالک کے قہر سے نہ ڈرے

جان وقت الرحیل فاتجہوا
ایہا النائمون انتبہوا

در بیان وعظ غیر متعظ

زیب تن کر کے غیر کی وردی
آکے ہو مدعی ہمدردی

غیر جب ترے احتراز نہ ہو
عمر بھر روزہ و نماز نہ ہو

کون سنتا ہے وعظ ایسوں کی
یہ نصیحت ہے چار پیسوں کی

واعظ غیر متعظ کا قول
سنتے ہیں سب تو پڑھتے ہیں لاحول

ایسے ارشاد سے ہے کیا حاصل
بجز اس کے کہ خوش ہوا اپنا دل

[illegible] قوم کے دلوں پہ اثر
بلکہ ہو ایک مضحکہ گھر گھر

[illegible] اس بات کو سمجھ لینا
بعد بھی چاہیے جو وہ کہہ دینا

[illegible] بھائی اس میں کیا ہے سخن
انما المومنون اخوان

[illegible] اپنے ہیں پیارے
دل کی ٹھنڈک ہیں آنکھ کے تارے

[illegible] سب صغیر و کبیر
ان میں کوئی امیر ہو کہ فقیر

فرق کیا ان میں سب برابر ہیں
امت حضرتِ پیغمبر ہیں

خود بھی پابندِ شرعِ پاک رہے
غضبِ حق سے خوفناک رہے

یہ شرائط اگر ہوں جمع تمام
تب اثر ہوگا وعظ و پند کا عام

بعض نے کی اطاعتِ شہوات
ہو گئے منکرِ ضروریات

دینِ اسلام میں فساد کیا
فاسد اوروں کا اعتقاد کیا

فرض تھا حج انہی زمانہ میں
کچھ نہیں نفع مکہ جانے میں

سود لینے میں راستبازی ہے
نفع جائز ہے کارسازی ہے

کیوں طبیعت کو کیجئے مجبور
روزہ رکھنا بھی کچھ نہیں ہے ضرور

واہ کیا دین کی اشاعت کی
خوب اصلاح کی شریعت کی

خاک اب رہ گئی مسلمانی
سر سے اونچا تو ہو گیا پانی

ترغیبِ پابندیٔ نماز

دیکھو ہمت کو اب نہ تم ہارو
کیا ہے رقت نماز میں یارو

مسجدوں میں نماز کو جاؤ
حکمِ معبود کو بجا لاؤ

کیا فضیلت نماز رکھتی ہے
فحش و منکر سے باز رکھتی ہے

ہر مکلف پہ فرض ہے ہر آن
امتثالِ اوامرِ یزدان

ہے یہ بیشک مکمل ایمان
دینِ احمد کا عمدہ ارکان

آدمی اس سے چست رہتا ہے
کارِ دنیا درست رہتا ہے

پایۂ دین ہے استوار اس سے
دین و دنیا کا ہے وقار اس سے

پاک رہتا ہے جسم و لباس
آنے پاتی نہیں نجاست پاس

[illegible] سب کام تو ہوں دل سے پسند
نہ ہوں بس اک نماز کے پابند

[illegible] ہیں تو ہوں تمام ادا [illegible]
وقت اس کا نکوئی ہو ہیہات

[illegible] شغلِ واہیات رہیں
محوِ لذاتِ بے ثبات رہیں

[illegible] آسان نماز مشکل ہو
لہو پر خوب رغبتِ دل ہو

[illegible] پسندِ عیش نہیں
کوئی ایسا نہیں کریگا کہیں

[illegible] کوئی وقت ٹھہرائیں
زحمت ایک تھوڑی دیر اٹھائیں

[illegible] ہے کیوں انصاف
صاف کہتا ہوں میں قصور معاف

[illegible] کی یہ سیہ کاری
کیا یہی ہے اطاعتِ باری

[illegible] خدا کا خوف کرو
اس کے قہر و عذاب سے تو ڈرو

[illegible] ہو کیوں بدنام
کیا ہوئی وہ حمیتِ اسلام

[illegible] کلام نہیں
گھنٹے دو گھنٹے کا یہ کام نہیں

[illegible] وہاں نماز قبول
ہوئے اعمال اس کے سب مقبول

[illegible] شام دیتا ہے
رزق سب کو مدام دیتا ہے

[illegible] یا انعام
دین برحق ملا ہمیں اسلام

[illegible] طاعت ہو
کچھ نہ پابندیٔ شریعت ہو

[illegible] از ہے
سب کو پابندیٔ نماز رہے

[illegible] ت ہو
برکتِ رزق میں [illegible] ہو

[illegible] وت
عجّلوا للصلوٰۃ قبل الفوت

عید کا دن ہے روزِ آدینہ
نیک اعمال کا ہے گنجینہ

خیر و خوبی کا ہو خدا سے سوال
روز جمعہ کے کچھ تو ہوں اعمال

اہلِ اسلام کی جماعت ہو
خالقِ دو جہاں کی طاعت ہو

مل کے اک دوسرے سے شاد رہے
خوش ہوں آپس میں اتحاد رہے

نہیں زنہار کسرِ شان اسمیں
نہیں خالق پر امتنان اسمیں

کچھ تو ہو زادِ آخرت کے لئے
عملِ خیر مغفرت کے لئے

زیست ہے بندگی حق کے لئے
کیا جیے گر گناہگار جیے

جو کرے گا بھلا بُرا جیسا
عوض اسکا ملے گا وہاں ویسا

ہے جزا نیکیوں کی باغِ نعیم
فعلِ بد کی سزا عذاب الیم

سب سمجھتے ہیں نیک و بد کو ضرور
پر کیا نفسِ شوم نے مجبور

دشمنِ بد کی دوستی ہے بُری
گزرتے [illegible] سحری

جو عقل تو ہے ساتھ مدام
اُس سے بھی لینا چاہئے کچھ کام

وہ تو ہر دم ہے مونس و غمخوار
کس لئے اسکو کر دیا بے کار

عقل کی بات کیوں پسند نہیں
گھر میں کیا کوئی عقلمند نہیں

سعی خیرات میں ہو شام و پگاہ
اعملوا خالصاً لوجہ اللہ

ترغیب پابندی روزہ

مژدہ جنت کا روزہ داروں کو
بخشوائیں گے جو ہزاروں کو

روزہ معبود کی عبادت ہے
عملِ خیر ہے سعادت ہے

بندگی خدائے اکرم ہے
سپرِ آتشِ جہنم ہے

دن کو ممنوع کھانا پینا ہے
خیر و خوبی کا یہ مہینا ہے

ہے تواضع فروتنی اس میں
نفسِ بد سے ہے دشمنی اسمیں

جو عمل کیجئے ثواب ہے وہ
جو دعا کیجئے مستجاب ہے وہ

روزہ داروں کی کیا ہی حرمت ہے
سب پہ ہر دم نزولِ رحمت ہے

ہر نفس پر ثواب ملتا ہے
اجر بے حساب ملتا ہے

کوئی مشغولِ ذکرِ باری ہے
کوئی قرآنِ حق کا قاری ہے

اس مہینے کا احترام کرو
روزہ رکھنے کا التزام کرو

[illegible] جو نہ رکھے گا
وہ عذابِ الیم چکھے گا

[illegible] کر کے ہو گیا مقہور
رحمتِ حق رہے گی اس سے دور

[illegible] ہونگے سب مسلوب
پھر امیدِ بہشت ہو کیا خوب

[illegible] نعمت وہاب
ہو گا بیشک وہ مستحقِ عذاب

[illegible] ایزدِ پاک
کس بُرے حال سے وہ ہو گا ہلاک

[illegible] ہوا
تابعِ نفسِ ناشکور ہوا

[illegible]
فاتقوا اللہ وافعلوا الخیرات

ترغیب ادائے زکوٰۃ

[illegible] دو
مالِ خمس و زکوٰۃ یار و دو

[illegible]
ہو دا آتوا الزکوٰۃ کی تعمیل

فرض ہے اعتدال اور خدا | دو خوشی سے زکوٰۃ مال سدا

مال دنیا ہو گر برابر کوہ | ہے پس از مرگ حسرت و اندوہ

جو رہا کچھ نہ کام آئے گا | جو دیا یہاں وہاں وہ پائیگا

اغنیاء پر ہے حق فقیروں کا | بھوکے محتاج گوشہ گیروں کا

کیا پریشان ہیں مفلس و نادار | فاقہ کش بے بضاعت و بیکار

گر ملے انکو حق خمس و زکوٰۃ | کچھ تو افلاس سے یہ پائیں نجات

کیا ملا حبس کر کے حق الناس | بجز اس کے کہ عام ہوا افلاس

اہلِ اسلام سب ضعیف ہوئے | مبتلائے بلا شریف ہوئے

یوں تو لاکھوں کا خرچ ہے ذرات | چار پیسے کی پر نہیں خیرات

اب بھی سمجھیں اگر غنیمت ہے | بعض کی اب بھی خوب ہمت

اس زمانہ میں کیا قساوت ہے | نے محبت ہے نے مروت ہے

ایک کھاتا ہے پیٹ بھرتا ہے | دوسرا پاس بھوکا مرتا ہے

اس کو اسکی ذرا نہیں پروا | درد کیسا اثر نہیں اصلا

کیسے دل سخت ہو گئے یارب | رحم فرما کہ وقتِ رحم ہے اب

دولتِ معرفت عنایت کر | سب کو توفیق دے عبادت

فائدے یوں تو اسمیں ہیں اکثر | ہے مگر مصلحت یہ واضح تر

کہ محبت بڑھے مروت ہو | ایک کو دوسرے سے قوت

غیر کا حق نہ رکھو اپنے پاس | فاتقوا اللہ فی حقوق الناس

ترغیب بجا آوری مناسکِ حج

قافلہ حاجیوں کا جاتا ہے | دیکھیں ہمراہ کون آتا ہے

جو کہ ہے مستطیع و صاحب وجہ | فرض ہے اس پہ حج بیت اللہ

ہر تونگر کو چاہیئے جائے | حج کے احکام سب بجا لائے

سب مناسک خلوص سے ہوں تمام | عرفات و منا و رکن و مقام

بعدِ احرام ہو نہ لاف و گزاف | خوب ہو احتیاط سعی و طواف

وہ سر و پا برہنہ خلق تمام | اور پہنے وہ جامۂ احرام

ہر طرف تلبیہ کی وہ آواز | وہ عمارات کوہ ہائے حجاز

وہ دعا حاجیوں کی وہ لبیک | اِنّا قائمون بین یدیک

سبکی وہ ایک وضع ایک لباس | کرتی ہے استوار دین کا اساس

ایک صورت میں پادشاہ و گدا | آیۂ تکلیف سب کی ایک صدا

ہیں ہر ایک ملک کے یہ حاجی سب | ہند و ایران و ترک و روم و عرب

اور نہیں دور یہاں سے بیت اللہ | پندرہ بیس روز کی ہے راہ

شغل امیروں کا اب سیاحت ہے | حج کو جائیں تو کیا قباحت ہے

اور جا تو فقط سیاحت ہے | یہاں سیاحت ہے اور طاعت ہے

کوئی جاتا ہے نلگری میسور | کوئی پونا کو اور کوئی بنگلور

حج مکہ کو اگر جائیں | سیکڑوں فائدے وہاں پائیں

لوگ آتے ہیں ملک ملک کے وہاں | ملتے ہیں صنف صنف کے انسان

سب مسلمان ہیں سب نماز گزار　　سب خدا ترس سب ہیں تجربہ کار
دل ترقی کی سمت مائل ہو　　مفت میں تجربہ بھی حاصل ہو
جائیں اٹلی سوئیس لندن کو　　آسٹریا فرانس جرمن کو
مصر جائیں گے شام جائینگے　　پر وہ مکہ کی راہ آئیں گے
کیا یہ حج ہے فقط فقیروں پر　　کیا نہیں فرض یہ امیروں پر
غربا ہی ہیں حکم میں داخل　　امرا اسمیں کیا نہیں شامل
نہیں ایسا نہیں سب انسان ہیں　　یہاں فقیر و امیر یکساں ہیں
واجب و سنت و حلال و حرام　　عام ہیں سبکو شرع کے احکام
پیروی جس نے کی شریعت کی　　اُسنے اللہ کی اطاعت کی
جس نے برعکس شرع پاک کیا　　اُس نے خالق کو خشمناک کیا
معصیت کی سزا وہ پائے گا　　کی اگر توبہ بخشا جائے گا
بعد ازاں معصیت سے باز رہے　　مدت العمر احتراز رہے
بعد حج ہو سفر مدینہ کا　　تا زیادہ ہو نور سینہ کا
ہو زیارت رسولِ داور کی　　پھر زیارات آلِ اطہر کی
پھر وہاں سے سب اپنے گھر آئیں　　کام بگڑے ہوئے سنور جائیں

خاتمہ دربیان محاسنِ اخلاق

حسنِ اخلاق پر ہے ختم کتاب　　ہے یہ بحرِ جواہرِ آداب
ہیں یہ اخلاق زیورِ انسان　　زینتِ نفس و جوہرِ انسان

حسنِ عادت میں ہے خردمندی　　خصلتِ نیک کی ہو پابندی
ترک ہو صحبتِ جہنی و غوی　　ہو ہر اک امر میں میانہ روی
سب کی نسبت وسیع ہوں اخلاق　　تا ہو مطلوبِ انفس و آفاق
عادت عجز و انکسار رہے　　نا ملایم سے ننگ و عار رہے
صحبتِ بد سے چاہیئے پرہیز　　احمقوں سے رہے مدام گریز
دردمندی ہو آدمیت ہو　　خیر کے راستے کی نیت ہو
روز دیکھیں سب اپنا حال و قال　　رات دن کے کریں شمار افعال
کتنے اچھے بُرے ہیں کتنے کام　　نفس رہتا ہے ہوشیار مدام
تا فضائل کا اکتساب کرے　　اور رذائل سے اجتناب کرے
حسنِ اخلاق سے ہے ملک آباد　　اس سے معمور ہیں دیار و بلاد
ہر کہ و مہ سے راستبازی ہو　　اہلِ حاجت کی کارسازی ہو
عاجزوں پر نگاہِ رحمت ہو　　مبتلائے بلا پہ شفقت ہو
واجب الرحم ہے ہر اک مضطر　　مہربانی رہے یتیموں پر
وعدہ ہو تو وفا بھی ہو مقصود　　اپنے بیگانے سب ہیں خوشنود
دوستی میں رہے ثبات و قرار　　فیض پاتے رہیں مصاحب و جار
ہے مقصود عام دلداری　　ہو ہر ایک غمزدہ کی غمخواری
ہو ادا حق صاحبِ آزار　　مستحب ہے عیادتِ بیمار
ہو مقابر میں گاہ گاہ گذر　　یاد آتی ہے اس سے موت اکثر
ہو فقیر و ضعیف و مسکین پر　　شفقت و الفت و کرم کی نظر

دو ہیں ہر وقت آدمی کے رفیق — ایک دشمن ہے ایک یار شفیق
دشمن اس کا ہے نفسِ امارہ — عقل ہے دوست جہان آرا
ہو مدارات ہر کس و ناکس — کوئی آزردہ ہو نہ ایک نفس
سینہ بغض حسد سے پاک رہے — دل محبت میں دردناک رہے
تنگدستی ہو یا فراغتِ بال — رہے ہر ایک حال میں خوشحال
فرق آئے نہ آدمیت میں — جد و کد ہو خلوص نیت میں
ایک مدت ہو شوقِ کسبِ خصال — تب ہے امید فوزِ حدِ کمال
مشق ہو رغبتِ طبیعت ہو — بے تکلف ہر ایک خصلت ہو
عقل کے حکم سے نہ ہوں باہر — لمس و ذوقِ لسان و سمع و بصر
قول جو ہو تو وہ سنجیدہ — فعل جو ہو وہ ہو پسندیدہ
طمع مال میں نہ عقل ہو گم — ہو ادائے امانتِ مردم
ہو سلوک طریق صدق و سداد — جمع ہو دولتِ صلاح و رشاد
ہو سعادت کی گرم بازاری — جنسِ خوبی کی ہو خریداری
ترک ہر اک سیاہ کاری ہو — فکر و تدبیر رستگاری ہو
دلپہ ہو منقش رہے یہ یاد — حرص ہے ہر گناہ کی بنیاد
رہے منظور دل رضائے الٰہ — نہ خیانت کی ہو کسی پہ نگاہ
کارِ دنیا میں انہماک نہ ہو — بد کہے کوئی خشمناک نہ ہو
خصلت سالکانِ راہِ خدا — ہے سدا کظم غیظ و عفو خطا
جرم غیبت سے احتراز رہے — سرقہ و افترا سے باز رہے

دست بردار ہو خیانت سے — شر سے بہتان سے اہانت سے
ہو زبان بند عیب جوئی سے — حرف گیری سے زشت گوئی سے
رہے غیظ و غضب کی بیخ کنی — دل شکستوں کی ہو نہ دل شکنی
زندگانی کا اعتبار نہ ہو — نشۂ مال مستعار نہ ہو
کافر نعمتِ الٰہ نہ ہو — طول امید و حبِ جاہ نہ ہو
نخوت و سرکشی و کبر و غرور — رہے ہر دم دل و دماغ سے دور
غم میں دل کو نہ بیقراری ہو — ہر مصیبت میں بردباری ہو
مالِ دنیا پر اعتماد نہ ہو — غیر سے بھی کبھی عناد نہ ہو
بے مروتِ دراز بد صورت — خلق بیجا گناہ بے لذت
آفت و رنج میں رہے خوشحال — ڈگنے نہ پائے پائے استقلال
ہو اگرچہ ہجومِ مکروہات — پر نہ چھوٹے عنانِ صبر و ثبات
ہو عمل میں رضائے حق مقصود — نہ رہے سمعہ و ریا کا وجود
نہ زیادہ مزاج ہو زنہار — اس سے جاتا ہے آدمی کا وقار
ہو نہ ہرگز معاشرت میں فساد — اس میں ہے خوبیِ معاش و معاد
نفسِ خود بیں کو ہو نہ استکبار — ہو کسی کا کبھی نہ استحقار
سرکشی سے زمین پر نہ چلے — بے محابا اٹھا کر سر نہ چلے
سعی اعمال میں قصور نہ ہو — اعتقادات میں فتور نہ ہو
خصلتِ نیک دوست ہے ہر آن — عادتِ بد ہے دشمنِ انسان
صبر و شکر و رضا کی عادت ہو — تا عمل مثمر سعادت ہو

اُردو مکتوب نویسی کے عناصر

انسانی خطوط ذاتی تاثرات اور احساسات کا عکس ہوتے ہیں۔ جس میں وہ اپنے مافی الضمیر کو مختصر سے مختصر الفاظ میں پیش کرتا ہے۔

رائے عامہ میں خطوط کی اہمیت مکتوب نگار کی ذات کے اعتبار سے معلوم ہوتی ہے۔ لیکن دراصل مکتوب نگار اپنی اہمیت خط کے ذریعہ منواتا ہے۔ اور مکتوب الیہ کی شخصیت پر اپنا اثر ڈال کر اس کو اپنا ہم خیال کرنا چاہتا ہے۔ اس طرح مکتوب الیہ کے ذریعہ مکتوب نگار کی شخصیت کا مرکزی تصور ذہن میں مرتسم ہو جاتا ہے اور رفتہ رفتہ خطوط اس کی شخصیت کا مجرد خاکہ بن جاتے ہیں۔ جس طرح تجریدی آرٹ میں مصور کی شخصیت، اس کا اثر جھلکتا ہے۔ اسی طرح خطوط کے الفاظ بھی وہ لکیریں ہیں جن کے سمجھنے والے ہماری فکر کی رسا ہماری مدد گار نہ ہو تو الفاظ آنکھوں میں تیرتے ہوئے حباب معلوم ہوتے ہیں۔ وہ نگاہوں کے ذریعہ دل و دماغ کو متاثر نہیں کر سکتے۔ اسی لئے تحریر اپنے لئے دوامی حیثیت رکھتی ہے۔ کیونکہ ہم صاحب تحریر کی عقل دوررس اور فہم رسا کو اپنے ظرف علم و فہم کے لحاظ سے قید زمانہ سمجھتے رہتے ہیں۔ اور ہماری علم کے وسعت کے ساتھ تحریر کی گہرائی کا

پتہ چلتا رہتا ہے۔ پس اس طرح تحریر صاحب تحریر کے سر پر بقائے دوام اور شہرت لازوال کا تاج لکھ دیتی ہے۔ تحریریں ہی کسی کی شخصیت کا وہ مثالی تصویر بن جاتی ہیں۔ جس کو ہم آئینہ فکر میں سے دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن بسا اوقات یہ مثالی تصویریں واضح و سیتں نہیں ہوتیں۔ اور بعض دفعہ خود ہمارا آئینہ فکر صاف و شفاف نہیں ہوتا۔ ان دونوں صورتوں میں ہم مکتوب نگار کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ لیکن جس طرح کامیاب مصور اپنی تصویر کے رنگ و نقش (نگار) نوک پلک (ہوتے قلم سے درست کرتا ہے۔ اور آپ اس کے آئینہ تصویر میں اس کے کمالات کی جھلکیوں کو دیکھ لیتے ہیں۔ بالکل اسی طرح بقول ڈاکٹر خورشید؎ انسان خاص خاص حماقتوں، لوگوں سے دلچسپیوں اور غیر شعوری حرکتوں سے ممتاز ہوتا ہے اور دوسروں سے ممیز کیا جا سکتا ہے۔ مکتوب نگار کا مخاطب نجی خطوط میں وہی ہوتا ہے جس پر وہ اعتبار کرے۔ جس سے دل کی بات کہہ دے۔ اگر دانستہ طور پر اپنی دل کی بات نہیں کی تب بھی اس کی مکتوب نویسی کا ایک خاص لہجہ اسے دوسروں سے ممیز کر دیتا ہے۔ مکتوب نگار اسی اعتبار سے مخاطب کو اعتبار کے قابل سمجھتا ہے اس کے سامنے دل کی باتیں رکھ دیتا ہے اس لئے کہ وہ اسے اعتبار کے قابل سمجھتا ہے۔ اور انہیں اندازوں میں محصور ہو کر وہ مخصوص لب و لہجہ میں گفتگو کرتا ہے۔ یہ معمولی باتیں ہی تصویر میں حرکت پیدا کرتی ہیں۔ خط و خال کی باریکیاں اجاگر ہو کر ہمیں بتاتی ہیں کہ یہ شبلی ہیں یہ حالی ہیں۔ اور یہ مہدی ہیں۔ یہ سچ کہا گیا ہے، اچھے اچھے مکاتیب بے ارادہ لکھے جاتے ہیں۔ اور بہت کم شخصیتیں اپنے خطوط لکھنے میں کامیاب ہوتی ہیں۔"

؎ ڈاکٹر خورشید الاسلام (علی گڑھ)

ہماری زبان میں مکتوب نگاری کی ابتدا غالب سے ہوئی۔ غالب نے
شروع میں اسہل انگاری کے طور پر اردو میں خط لکھنے شروع کیے۔ آہستہ آہستہ
ان کے خطوط بے تکلفی، سادگی اور حسنِ بیان کے اعتبار سے شہرت پا گئے۔
یہاں تک کہ خود غالب کو بھی اپنے خطوط کی اہمیت کا احساس ہونے لگا۔ اس
طرح انہوں نے فطری اندازِ تحریر اختیار کر کے دلچسپی کا ایک نیا سامان پیدا
کر دیا۔ انہوں نے اپنی ذہانت سے کام لے کر بذلہ سنجی اپنے خطوط میں قائم رکھی۔
اور ان کو صحیح معنوں میں اپنے جذبات و تاثرات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ روز
مرہ کی زندگی میں جو واقعات پیش آئے۔ جو حالات بیتے اور جس طرح ان کے
دن کٹے انہوں نے بعینہ بغیر کسی مطالبہ کے ان ہی تاثرات کا اظہار کر دیا۔
اس طرح غالب کی زندگی کا عکس ان کے خطوط میں ملتا ہے۔ جس میں بلاشبہ
کوئی مبالغہ اور تصنع نہیں۔

غالب نے اردو کو اپنے خطوط کے ذریعہ اسلوب دیا۔ یہ اسلوب اس سے
پہلے نہیں تھا۔ غالب سے پہلے فارسی نثر کے نمونے اور فارسی نثر مصنوعی
کا نمونہ تھے۔ غالب نے اردو خطوط میں نہ فارسی نثر کا کوئی نقش کھینچا اور نہ
لفظی بازی گری سے خط کو الفاظ کا گورکھ دھندا بنا دیا۔

بلکہ سادگی اور پرکاری دونوں ساتھ ساتھ خطوط میں قائم رکھی گئیں!۔

ان کے خطوط میں وہ زبان ہے جو وہ خود بولتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے
کہ خط نصف ملاقات ہے۔ اسی لئے مراسلہ کو مکالمہ میں بدل دیا۔ اور خطوط کے
ذریعہ نصف ملاقات کا سلسلہ قائم رکھا۔ غالب مجلس آرائی کے شیدائی تھے۔

[illegible] خاص ضرورت ہی سے گھر ہی میں جاتے تو جاتے۔ ورنہ دیوان خانے
[illegible] ان کا پورا وقت گذرتا۔ یوں بھی ان کی شراب نوشی کے سبب ان کی
[illegible] ان کا عملی طور سے مقاطعہ ہی کر رکھا تھا۔ ان کے برتن الگ رہتے تھے
[illegible] کوئی ہاتھ نہ لگاتا تھا۔ اس لئے انجمن آرائی ہی غالب کی وقت گذاری
[illegible] واحد ذریعہ تھی۔ کچھ ان کے احباب ان کے پاس موجود رہتے۔ یا اکثر و بیشتر
[illegible] وقت وہیں گذارتے۔ کچھ ان کی نگاہوں سے دور لیکن دل سے قریب تھے
[illegible] کے ذریعہ ان سے باتیں کرتے۔ اپنی کہتے ان کی سنتے۔ اس طرح
[illegible] محفل ہمیشہ گرم ہی رکھتے تھے۔ اور گھر کی پریشانی بے اولادی کا غم
[illegible] اور ان تمام ناکامیوں کا علاج ان کے پاس صرف احباب کی محفلیں
[illegible] جن کے سہارے وہ ان ناکامیوں پر ہنستے رہے۔ گھر کی ویرانی
[illegible] ویرانی سے زیادہ ہونے کے باوجود پھر بھی وہ خانہ نشین ہی رہے۔
[illegible] اور تلخ کامیوں نے خود ان کی زندگی میں توازن پیدا کر دیا تھا۔ اور
[illegible] توازن ان کی مکتوب نگاری میں بھی قائم رہا۔ انھوں نے انشا پردازی کو
[illegible] کر استعمال نہیں کیا کہ اس کے ذریعہ اپنا علمی سکہ اغیار کے دل پر
[illegible] اپنے قلم کی روانی سے دل کی بات کا عکس کاغذ پر اتار دینے کا طریقہ
[illegible] اسی لئے ان کے خطوط مشکل تراکیب اور دقیق الفاظ سے کسی کو
[illegible]

[illegible] شیخ محمد اکرم صاحب

آل احمد سرور نے ان کی بیباک صداقت پر زور دیا ہے کہ "انہوں نے کبھی اپنی شخصیت کو نہیں چھپایا، وہ جیسے تھے ویسے ساری عمر رہے۔ انہوں نے اپنی زندگی کو اس زمانے میں کبھی نہیں چھپایا جب چھپانا زیادہ مناسب تھا۔ ان کی شاعری کی عظمت ان کے خطوط سے اور بھی زیادہ عزیز ہو جاتی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ محض ایک فلسفی نہیں تھے بلکہ ہمارے دل کی آواز ہیں۔ ان کے خطوط سے ان کی انسانیت، ان کی لغزشیں، ان کی وضع داری نبھانے کی آخری کوششیں، ان کی کنبہ پروری، اپنی کوتاہی پر ہنس لینے کا جذبہ، دہلی سے بساط اُلٹ جانے پر عالم خیال میں انجمن آرائی کا ولولہ، زندگی سے آخر تک لڑنے اور مایوس ہونے کے بعد پھر عزم تازہ پیدا کرنے کا جذبہ، غالب کے خطوط کو سدا بہار جوانی عطا کرتے ہیں۔"

انہوں نے بقول خود زبان قلم سے ہجر کو وصال بنا دیا۔ فاصلے کو تھوڑی دیر کے لئے مٹا دیا۔ نثر نگاری میں تنقیدی شعور پیدا کیا۔ روزمرہ کی معمولی باتوں میں انہوں نے دلچسپی پیدا کر دی اور صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے بھی تلخ گوئی کو قریب نہیں آنے دیا۔

غرض غالب اردو مکتوب نویسی میں رہنما اور خضر راہ کی حیثیت رکھتے ہیں چاہے ان کی اپنی اردو غزلوں اور اردو کلام پر ناز نہ رہا ہو لیکن اردو خطوط پر ناز تو ہمیشہ رہا۔ یہ اور بات ہے کہ اس ناز میں سراسر حقیقت ہی تھی۔

غالب کے بعد سر سید ہیں۔ سب سے پہلے سر راس مسعود مرحوم نے اپنے دادا (سر سید) کے خطوط کا مجموعہ ۱۹۳۱ء میں شائع کیا۔ اب حال میں

محمد اسمٰعیل پانی پتی نے مکتوبات سر سید کے نام سے ان کے تمام خطوط جو تقریباً [illegible] سو ہیں، لاہور سے شائع کر دیئے ہیں) جنہوں نے غالب کا بقولے تتبع نہیں [illegible] تو کم از کم ان خطوط سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوئے۔ اور اس تاثر نے ان کو انہیں راہوں پر لگا دیا جن پر غالب چل چکے تھے۔

سر سید کے سامنے اردو مکتوب نویسی میں فن سے زیادہ مقصدیت مد نظر [illegible]۔ اسی لئے ان کے خطوط زبان و ادب کے ساتھ عمل کے لحاظ سے افادیت [illegible] ایک خزینہ ہیں۔ جن میں پرائیویٹ زندگی کا خاکہ بھی ہے اور تعلیمی و اصلاحی [illegible]میوں کا خاکہ بھی۔ گویا یہ ہندوستان کے گزشتہ پچاس برس کا فوٹو ہیں [illegible] حیثیت ادیب سے زیادہ ایک ریفارمر، مصلح قوم کی تھی۔ اس لئے [illegible] ان خطوط سے سر سید کی قومی بھلائی کا پتہ چلتا ہے۔ نیز یہ کہ وہ کن لوگوں [illegible] کرتے تھے، اور کن کا احترام۔ کس سے رواداری برتتے تھے، اور کس سے [illegible] غرض ان کے خطوط میں کہیں بناوٹ کا رنگ نہیں۔ وہ جیسے [illegible] ان تاثرات کا اظہار انہوں نے خطوط میں کیا ہے۔ بسا اوقات [illegible] انداز نے کسی ایسی ہی بات کو غیر اہم بنا دیا جو کسی دوسرے کے لئے اہم ہو۔ [illegible] ان پر کیچڑ اچھالنے کی کوشش کی، انہوں نے ہنس کر ٹال دیا۔ انھوں [illegible] بڑے خطوط نظر انداز کر دیئے گویا ان کے لئے کوئی بڑی بات [illegible] ان کے خطوط کے ذریعہ کسی مصلح یا ریفارمر کے صحیح خیالات کا اندازہ [illegible] حال وہ جواب دینے میں فیاض تھے۔ ان کے خطوط میں برجستگی [illegible] ایک سرمایہ ہے۔ جس میں تصنع اور آورد کا نام نہیں۔ یہاں تک

اپنے دوستوں کو اپنے ہاتھ سے خط لکھتے۔ جس میں مزاح و ظرافت کا رنگ ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ خط کے خاتمہ پر ہمیشہ خاکسار لکھا کرتے تھے، اتنے بزرگ ہونے کے باوجود جب ان کے خطوط میں اس قسم کی محبت کا اظہار ہوتا تھا تو اُن کی عظمت کا احساس اور بھی زیادہ ہو جاتا ہے۔

جس طرح وہ مقالہ نویسی میں صاف اور سچی بات کا اظہار بلا تامل کر دیتے تھے، اسی طرح خطوط میں بھی وہی انداز قائم رکھا۔ جو اُن کی صفائی قلب اور اظہارِ خیال کی آزادی کی دلیل ہے۔ بحث و مباحثہ میں بھی تہذیب اور شائستگی کا دامن ہاتھ سے چھوڑنا وہ پسند نہیں کرتے تھے۔ بالکل اسی طرح ان کے خطوط میں جذباتی گفتگو کا کہیں پتہ نہیں۔ بعض لوگ سرسید کی پالیسی پر معترض رہے کہ انہوں نے انگریز پرستی سکھائی (یہ بات اور ہے کہ خود اُن کی پوری زندگی انگریز کی غلامی میں گذر گئی) لیکن انہوں نے اس کی طرف توجہ نہیں کی کہ (انگریزی امپیریل ازم) سلطنت انگریزی کی شہنشاہیت کے دور میں اگر سرسید باغیانہ روش اختیار کر لیتے تو اس کا اثر (نتیجہ) قوم کے لئے بھی مفید ثابت نہیں ہوتا معلوم نہیں کتنی نسلوں تک مسلمان شدائد کی زنجیروں میں جکڑے رہتے۔ اور سرسید ایک لاتعداد مخلوق کا خون اپنی گردن پر لے جاتے۔

سرسید کا رجحان طبع ان خطوط سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ وہ کس قدر عزم اور پُر حوصلہ انسان تھے، اُن کے اپنے بھی دشمن تھے اور پرائے بھی لیکن ایسے رہے جیسے بتیس دانتوں میں زبان۔ وہ کسی کام کو کرنے سے پہلے اس کے نتیجہ پر غور کر لیتے تھے۔ اس کے بعد جب ارادہ کر لیا تو پھر

انہیں ہٹتے تھے۔

غالب کی مکتوب نگاری نے اپنے خطوط کو اپنے تاثرات کا عکس بنا کر پیش کیا۔ لیکن ہندوستان کے پچاس برس کے علمی، مذہبی، سیاسی اور معاشرتی واقعات کا نوٹ سرسید ہی کے خطوط میں۔ اسی لئے دونوں کے بیان میں ایک نمایاں فرق تھا جس کو دوسرے الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ ایک کو غم عشق تھا لیکن دوسرے کو غم روزگار۔ ایک اپنے جینے کے لئے مرتا تھا۔ دوسرا دوسروں کے جینے کے لئے دم دیتا تھا۔ ایک منفکر تھا، دوسرا مصلح۔ ایک کی انشا پردازی میں اپنے غم کا رونا ہے دوسرے کے خطوط میں قوم کا رونا۔ ایک کو وسعتِ بیان کے لئے تنگنائے غزل سے نکلنے کی فکر تھی۔ تو دوسرے کے سامنے ادب کے گوشوں کا تقاضا حیات فرد نہیں تھا، بلکہ حیاتِ قومی۔ غالب کے خطوط اگر فرد کی کائناتِ غم کا دفتر ہیں تو سرسید کے خطوط ملت کی بہبودی کا بحرِ بیکراں۔ ایک کے خطوط میں ہم اسکی تصویر دیکھتے ہیں، دوسرے کے خطوط میں ہم اپنی تصویر۔ دنیا کی تمدن سوسائٹی میں فرد اور ملت کا رشتہ نہ ٹوٹتا ہے اور نہ ٹوٹ سکتا ہے۔ ان شعور سرسید ملت کی بقا اور عزت کے لئے افراد کی زندگیوں کو سنوارنے کا بیڑہ اٹھایا تھا۔ سرسید کے ایثار کی یہ قابلِ قدر مثال کم نہیں ہے کہ بقول آرنلڈ جب وہ مرض الموت میں مبتلا تھے تو نہ ان کے پاس رہنے کو گھر تھا اور نہ اپنے کفن تجہیز و تکفین کے لئے پیسہ۔"

انہوں نے دورخی پالیسی اختیار نہیں کی۔ جو لوگ بھی اس کے لئے اختیار کر چکے تھے وہ بھی سرسید کو بُرا بھلا کہنے میں پیش پیش رہے۔ اور اسی دورخی پالیسی نے

ہندو کی غلامی پر جا کر دم لیا اور تقریباً آج ایک صدی بعد معلوم ہوا کہ ہندو کی غلامی سے انگریز کا طوقِ غلامی کس قدر بہتر تھا۔ اگر سرسید نے موقع پرستی اختیار بھی کی تو اس میں اپنی ذات کے لئے کچھ فائدہ منظور نہ تھا۔ بلکہ قوم ہی کی بھلائی مضمر تھی۔ انگریز کی نگاہ میں ہندو سے زیادہ مسلمان معتوب رہا۔ پنجاب میں اور مشرقی بنگال میں خصوصاً مکاتیبِ اسلامی اور اسلامی درسگاہیں آہستہ آہستہ بند کردی گئیں یا ان کی طرف سے روگردانی اختیار کرلی گئی۔ اور اس طرح مسلمان جو پہلے ہی اقتصادی لحاظ سے پسپا ہو چکے تھے انھیں اب تعلیمی لحاظ سے بھی آہستہ آہستہ پسپا کر دیا گیا۔ بظاہر لاہور میں اورینٹل کالج کھولا گیا کسی ایک علم کے شیدائی نے عربی و فارسی علوم کی تباہی اپنی آنکھوں سے دیکھنی گوارا نہیں کی۔ لہٰذا اورینٹل کالج کا قیام عمل میں آیا۔ لیکن انیسویں صدی کے آخر میں لاتعداد (اسلامی مدرسے) اسلامی مکتب مسلمان کش پالیسی کے تحت بند کردیئے گئے اور اس طرح مسلمانوں کو اقتصادی اور علمی دونوں لحاظ سے مفلس بنانے کا جامع منصوبہ حکومت کی طرف سے تیار کیا گیا۔ سرسید کی جہاں بین نگاہوں نے اِن تمام حالات کو دیکھا اور انہوں نے ایک واضح لائحہ عمل کے ساتھ قوم کو انگریزی تعلیم کی دعوت دی۔ انہوں نے مشرقی علوم کے راستے تو بند نہیں کئے بلکہ مغربی علوم کو بھی سیکھنے کی دعوت دی۔ سرسید کے خطوط سے واضح ہے کہ اگر واقعی خوشامد پسند ہوتے تو اُن کو ذاتی فائدہ حاصل کرنے کے لئے نا معلوم کتنے مواقع ملے لیکن کبھی ایسے موقعوں سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ اگر اُن کا شعار خوشامد پسندی ہوتا تو وہ کبھی "رسالہ اسبابِ بغاوت..."

دیکھے۔ آخر یہ سرسید کو ہی لکھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ ہندوستان کی اکثریت نے اس موقع پر کیوں خاموشی اختیار کرلی تھی۔ یہ یقینی بات ہے کہ انہوں نے بڑے خلوص کے ساتھ تعاون اور تعلم کو مسلمانوں کے لئے ضروری سمجھا (جس کو ہندو سرسید سے قبل ہی اپنا چکے تھے) سرسید کا کردار ہی تھا کہ جس نے عوام میں زندگی کی لہر دوڑا دی۔ اور علی گڑھ تحریک نے "خود جیو، دوسروں کو جینے دو" کے اصول کو اپنایا۔ اگر مسلمانوں کو بعد کے دور میں اسی قسم کے عملی تعاون کا جواب ملتا رہتا تو پھر تقسیم کا سوال ہی نہیں پیدا ہو سکتا تھا۔

آزاد دہلوی

مولانا محمد حسین آزاد کے مکتوبات "مجموعۂ مکتوباتِ آزاد" کے نام سے آغا محمد طاہر صاحب نبیرۂ آزاد مرحوم نے پہلی مرتبہ ۱۹۲۳ء میں اور دوسری مرتبہ ۱۹۲۷ء میں لاہور سے شائع کئے (اس سے قبل مخزن میں شیخ عبدالقادر صاحب مرحوم ان کے بعض خطوط شائع کر چکے تھے) یہ خطوط ۱۸۷۰ء اور ۱۸۸۹ء کے درمیان لکھے گئے۔ بہرحال یہ مجموعے میں قلیل اور افادیت میں بے حد کثیر ہیں۔ آزاد نے ان مکتوبات میں بے حد صاف، شستہ زبان استعمال کی ہے، نہ پیچیدار قدیم اسلوب ہے۔ نہ فارسی کے استعارے ہیں اور نہ مرکب جملوں کا استعمال ہے۔ تعجب ہے کہ آزاد کی طبع رسا نے خطوط میں اس نئی روش کو اس انداز سے اختیار کیا کہ گویا دل کی زبان بول رہے ہیں۔ اُن کے بعض بعض خطوط تو ایسے ہیں کہ اگر خطوطِ غالب میں ان کو شامل کر دیا جائے تو تمیز ہی مشکل ہوگی۔ واقعی "ان کی تحریر سے تقریر کا لطف آتا ہے" یہ خطوط ان کی برجستگی اور بے ساختگی قلم کا نمونہ ہے اور اس قدر بے تکلفی کا مظہر ہیں کہ ان کی پرائیویٹ زندگی بھی (اُن خطوط سے)

نظر کے سامنے آگئی ہے۔ بلاشبہ ہر خط سے ان کے اخلاص و محبت کا مظاہرہ ہوتا ہے اس میں تصنع اور آورد نام کو نہیں۔

آزاد کے یہ خطوط اُن کے جذبۂ رواداری کی دلیل ہیں۔ جس میں ہندو و مسلمان دونوں کے ساتھ یکساں محبت کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔ آزاد علم کے رسیا تھے۔ اور علم حاصل کرنے والوں کی طرح طرح سے ہمت افزائی کرتے تھے۔ یہ خطوط نہ اتنے مختصر کہ سرکاری گزٹ معلوم ہوں، نہ اتنے طویل کہ طبیعت پر بار ہوں۔

اسی مجموعے کے ایک خط میں سر سید نے آزاد کو اپنا بھتیجا لکھا ہے جس سے سر سید کے کمال محبت اور تعلق قدیم کے اظہار کے ساتھ ساتھ مولانا آزاد کی علمی لیاقتوں کا بھی اعتراف ہے۔ "مولوی محمد حسین صاحب سے اور میرے خاندان سے ایک ربط خاص ہے۔ ان کے دادا اور میرے والد میں ایسی دوستی تھی کہ لوگ بھائی بھائی کہتے تھے۔ اور ان کے والد مولوی محمد باقر صاحب مرحوم سے مجھے اور خصوصاً میرے بڑے بھائی مرحوم سے بسبب ہم عمری کے ایسا ہی ارتباط تھا۔ پس اگر سچ پوچھو تو مولوی محمد حسین صاحب میرے بھتیجے کے برابر ہیں۔ مگر چونکہ علم و فضل، نیکی و نیک ذاتی میں مجھ سے زیادہ ہیں۔ اس لئے میں اُن کو مکرم و معظم اپنا سمجھتا ہوں۔" (مکتوب ...)

اللہ اللہ کیا زمانہ تھا کہ سر سید جیسا بزرگ انسان اپنے سے چھوٹوں پر اس قدر شفقت و عنایت اس انداز کی کرے۔ اور ان کے کمال علمی کا اعتراف کر کے انھیں اپنا مکرم و معظم کہے۔ ورنہ آج تو یہ حالت ہے وہ عیاں ہے اور "عیاں را چہ بیاں"

راقم۔ آغا محمد باقر صاحب نبیرہ آزاد مرحوم کا ممنون ہے کہ انہوں نے مکتوبات آزاد کا نسخہ میرے پاس مطالعے کے لئے بھیجا۔ اگر یہ نسخہ نہ ملتا تو نگارشات آزاد سے استفادہ غیر ممکن تھا۔ اگر موصوف مزید حواشی کے ساتھ اس کو دوبارہ شائع کرا دیں تو یہ ایک اہم خدمت ہوگی۔ ۱۲۰۔

کبھی کبھی انہوں نے اپنے آپ کو غالب فرض کر لیا۔ اور خاتمہ پر کبھی بندہ، کبھی نیاز مند کبھی آزاد محمد حسین عفی عنہ، لکھا گئے۔

بعض خط "صاحب" سے شروع کئے اور گویا خط کیا ہے۔ تقریر ہے۔ انہوں نے غالب کے انداز کو اس قدر اپنایا کہ ان کے ہاں سلاست و روانی غالب سے کسی طرح کم نہیں۔

"جناب من! ہزار لعنت ہے مجھ پر کہ تم جیسے شخص کو ایسے اضطراب میں ڈالتا ہوں۔ اور لاکھ لاکھ لعنت ہے میرے اعمال و اشغال پر کہ مجھے ایسے عالم میں ڈال رکھا ہے کہ جو جی چاہتا ہے اور جو واجب اور فرض عین ہے وہ کر نہیں سکتا تھا۔ ... تم تو سچے ہو۔ تمہیں میرے حال کی بھی خبر ہے؟"

ایک اور خط میں آزاد اس طرح لکھتے ہیں، بلکہ باتیں کرتے ہیں۔

"صاحب! آپ تو دور بیٹھے احمق بنتے ہیں، جو اصل بات ہے۔ وہ مختصر ... اب جھوٹے ڈھکوسلے آپ کے خوش کرنے کو بناؤں، یہ مجھ سے ہو نہیں سکتا۔ ... ہے کہ خلیفہ صاحب سے ہو سکے، خط جیسی جو ہو لکھو، لیجئے آپ کو یہ ... ہو جائے اور جو شاید کہ ہمیں بفضہ بر آرد پر وبال عنقا گردد۔"

ان کا انداز بے تکلفی کے ساتھ جس محبت و اخلاص پر مبنی ہے وہ اُن کے ... سے ٹپکتی ہے، گویا ابھی اُٹھ کر گلے مل رہے ہیں۔ دیر سے ملنے کی شکایت ... ہیں، اور جو شکوہ پیدا ہو گیا ہے۔ اُس کے دور کرنے کی فکر بھی ہے۔ ذرا یہ فقرہ ... سنا چلوں: "اجی آزاد صاحب! آپ نے تو بڑی راہ دکھائی۔ میں نے جانا روٹھ گئے۔ اب دیکھئے کب ملیں گے، بارے الحمد للہ کہ آج ... کو خط آیا۔"

وہ ایک ہی خط میں آپ سے خطاب کرتے کرتے بے تکلفی کے عالم میں "تم"
بھی لکھتے ہیں اور پھر آپ یا تم سے خطاب کر کے باتیں کرنے لگتے ہیں۔

ان کے خطوط کی برجستگی کا لطف شروع سے آخر تک قائم ہے۔ بے تکلف
باتیں ہیں کہ ہو رہی ہیں، گویا مخاطب ان کے بالکل سامنے بیٹھا ہے۔ خط شروع کر
کا انداز ایسی گفتگو ہے جس میں دوری کا تصور آ ہی نہیں سکتا۔

"میاں میرے! تم تدبیروں کے رستم ہو۔ جو کوئی نہیں کرتا سو تم کر گذرتے ہو"

"لو صاحب آج تک انتظار میں خط لکھا ہوا رکھ چھوڑا کہ جواب یا صواب
ملے، مگر مشکل یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب خود بھی رجسٹراری سے محروم ہیں۔ اپنی
کوشش کر رہے ہیں اور کارگر نہیں۔"

"صاحب کیا کہوں، پتھر کی چھاتی اور لوہے کا کلیجہ کر لو، تو جب میرے خط کو
اور مجھ سے خط و کتابت کرو۔"

روزمرہ و محاورات کا استعمال اتنا برجستہ کرتے ہیں کہ گویا لفظ کیا ہے نگینہ ہے
کہ انگوٹھی میں جڑ دیا گیا ہے۔ جس طرح انیس کے شعر میں سے کوئی لفظ ادھر ادھر
نہیں کر سکتے، گویا یہ لفظ بس اسی جگہ کے لئے موزوں ہے۔ بلکہ اسی طرح آزاد کے
خطوط میں یہی تاثر پیدا ہوتا ہے۔ "بھلا اگر ہو سکے تو مجھے بنوا دو اور ضرور بنوا دو
ملا مقرب نے پان سو روپیہ بھر کا احسان رکھ کر ایک دیا۔ مگر معلوم ہوا
ہے۔ یہ کام فقیری کا ہے۔ تم جیسے شاہ لوگوں سے ہوتا ہے نہ کہ شاہ لوگوں سے۔
کچھ لاگت ہوگی وہ میں دوں گا۔ اگر کہئے تو پیشگی بھجوا دوں۔"

نام نذیر فراق دہلوی مرحوم کے نام خطوط ان کی بے مثل شستہ اردو کے

ہیں جن کی لطافت اور حسنِ بیان اردو ادب میں جواب نہیں رکھتی۔ نام نذیر
تھے۔ پہلی بیوی کا انتقال ہو گیا تھا۔ عرصہ تک دوبارہ شادی کے لئے
عرصہ کے بعد والدین کے شدید اصرار پر ایک جگہ مناسب رشتہ ہو گیا۔
معلوم ہوا۔ اس واقعہ نے ان کو متاثر کیا۔ انہوں نے مبارکباد کا خط لکھا۔
صاف اور کھلا، کہ کوئی دل کی بات چھپی نہیں رہی۔ معلوم ہوتا ہے کہ آزاد مسرت
اور اس قدر خوش ہیں کہ بے پایاں۔

"عزیز اقبال نشان من۔ بعد از دعائے فراواں معلوم باد۔ کہ خدا کا شکر ہے
آ گیا اور تم نے اپنے ماں باپ کے فرمانے سے اپنا گھر پھر بسا لیا۔
اور یہ ستم دیکھو۔ معاذ اللہ۔ برسوں رنڈوے بیٹھے رہے۔ چلو اچھا ہوا۔
پہلی بیوی کی طرح خاطر خواہ مل گئی۔ پھر چڑھی اور دودو۔ بیوی
بُرا نہ ماننا۔ اب تمہاری دلی میں ذات پات کا بالکل خیال نہیں کرتے
ہیں۔ باہر والے جو کہتے ہیں کہ دلی والے بیجڑ ہیں، تو کیا جھوٹ کہتے
والد بڑے لائق آدمی ہیں اس لئے انہوں نے تمہارے پسند کی بات
انہوں نے مناسب سمجھا، وہاں شادی کی۔ خاتون جنت کے طفیل سے یہ
ساز گار ہو۔ پھولو پھلو۔

دعا کا محتاج

بندہ آزاد — لاہور

تہذیب اور سوسائٹی کی رونق آج بھی اُن بزرگوں قدموں کی بدولت ہے
کے سد نشین ہو کر آگے بڑھنے والوں کی ہمت افزائی کرتے ہیں۔ اُن کی

ترقیوں سے خوش ہوتے ہیں۔ قدم قدم پر اُن کا دل بڑھاتے ہیں۔ آزاد ایسے ہی حضرات میں سب سے آگے ہیں۔ وہ راستہ چل کر بتا گئے ہیں کہ یوں علم و ادب کی محفلوں میں چراغ سے چراغ جلتا ہے اور اس طرح کام کرنے والوں کی صلاحیتوں کو مہمیز کرتے ہیں۔ فراق نے ایک رسالہ سات طلاقنوں پر مشتمل آزاد کے پاس اصلاح زبان کے لئے بھیجا۔ آزاد۔ فراق دہلوی مرحوم کے اسلوب بیان، لطف زبان سے بہت متاثر ہوئے اور جس انداز سے انہیں داد دی، کئی بار آپ بھی پڑھئے اور آزاد کی انشاء پردازی اور پاکیزگیٔ تحریر پر عش عش کیجئے۔ کہ گفتگو کر رہے ہیں یا منہ سے پھول جھڑ رہے ہیں۔ ہر فقرہ سادگی کے ساتھ ساتھ پُرکار۔ ایک ہی خط میں آزاد کی حیرت، خوشی، اطمینان اور اسی کے ساتھ نصیحت کے کارگر موتی اپنی جگہ موجود۔ ایک بزرگ انسان ہے جو انکسار و اخلاق کا مجموعہ ہے اور دردمند دل کی دعا کا طالب ہے۔

عزیز اقبال نشان من سید ناصر نذیر فراق۔ سلامت

بعد از دعائے فراواں معلوم باد کہ بھائی تمہارے سات طلاقنوں کے قصے پڑھ کر میرے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ خدا کی پناہ کس بلا کی پھوہڑ اور گنگیل تھیں۔ میں دیکھتا ہوں، تمہاری نثر، تمہاری نظم سے زیادہ مزیدار ہو چلی ہے۔ خدا رکھے، دلی کے رہنے والے، خواجہ میر درد کے نواسے، تم اردو نہ لکھو گے اور کون لکھے گا۔ تمہارا رسالہ اسی قابل ہے کہ چھپوایا جائے اور لڑکیوں کو پڑھایا جائے۔ میں نے جا بجا اصلاح دے دی ہے، غور سے دیکھ لینا۔ بیرنگ پیکٹ بھیجتا ہوں۔

۳۰ رجون ۱۸۷۶ء

دعا کا محتاج بندہ۔ آزاد لاہور

آزاد خطوط میں خطوط کا سا اعتدال رکھتے ہیں۔ اور اُن میں افراط و تفریط نہیں نہ انشاپردازی کا زور دکھاتے ہیں، نہ کسی کو مرعوب کرتے ہیں۔ ایک وقار، سکون، تحمل اور محبت

اخلاقت کا پاکیزہ نمونہ ہیں۔ وہ پرانی تہذیب کے صحیح معنوں میں نمائندے تھے۔ اپنی وضع داری اپنی جگہ موجود، شرافت اور رکھ رکھاؤ میں ذرا فرق نہیں۔ لیکن انکی اخلاقی جرأت کا اندازہ ان کے خطوط سے کیجئے۔ ایسی جرأت جس میں حقیقت کے ساتھ بدمزگی نہیں آنے پاتی۔ ایک سلامت روی کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے جو انداز انہوں نے خطوں کی مختصر باتوں میں جو دکھائے وہ ہماری تہذیب کے انمول موتی ہیں۔

مگر ضرور ہے کہ آزاد علمی کاموں میں مشغول رہنے کے سبب طبعاً آزاد پسند نہیں تھے ابتدا میں کثرتِ غم اور بعد میں تصنیف و تالیف کی کثرت نے ان کو زیادہ خط لکھنے کے موقع نہیں دیئے۔ ویسے بھی وہ محض خطوط کے سہارے زندگی بسر کرنے والوں میں سے نہیں تھے، انہوں نے خطوط کو وقت گزارنے کا ذریعہ نہیں بنایا۔ اس لئے ان کے خطوط زیادہ تعداد میں نہیں مل سکے۔ ورنہ وہ اپنی قدر و قیمت میں ہزاروں پر بھاری ہیں۔ آج تقریباً سو سال پہلے کی زبان انہوں نے اس طرح خط میں سمو دی ہے گویا آج کی زبان ہے۔ جس میں کہیں بھی کھینچ کا اثر نہیں آیا۔ یہ انکی نیک نیتی کا نتیجہ ہے کہ آج آزاد مجموعہ اپنے علمی کاموں کے سبب شہرت عام و بقائے دوام کا مالک بنا ہوا ہے۔ اور ہم ان کے احسانات سے گراں بار ہیں۔ اور ان کی تحریر کا ہر لفظ اردو زبان کی بہتری کے لئے ایک گراں بہا خزانہ ہے۔

ویسے بھی یہ تو عطیہ الٰہی ہے کہ شبلی جیسے نامور اور فرید فرد بھی چاہے اُن سے اختلاف کریں لیکن ان کی گپیں بھی اُن کو تو وحی ہی معلوم ہوتی ہیں۔

ع این سعادت بزور بازو نیست

آزاد کے علمی و مختلف مسائل کو بھی (علم اللسان، علم دلوے مالا) جب انشا
کے انداز میں لکھا تو وہ ایک نئی چیز معلوم ہوئی۔ لیکن اگر آزاد اس رنگ میں
بھی لکھتے تو ہو سکتا تھا کہ تعلی کے جذبہ کا طعنہ دیا جاتا۔ لیکن ان کے سامنے خطوط
کی حیثیت مخاطب کے ساتھ اسی انداز کی گفتگو کرنا تھی، جس رتبہ کا وہ اہل تھا
اس لئے سید حسین بلگرامی اور ناصر نذیر فراق کے نام لکھے ہوئے خطوط میں آپ
بین فرق ملے گا۔ آج بھی پاک سرزمین پر رہنے والوں کو سلیس و پاکیزہ زبان سیکھنے اور
بولنے کے لئے آزاد کی علمی خدمات سے فائدہ اٹھانے کی پہلے سے زیادہ ضرورت

شبلی

شبلی کی نظر کے سامنے اردو خطوط نویسی کے تین نمونے موجود
تھے۔ غالب، آزاد اور سرسید کے خطوط۔ آزاد کے خطوط
انشا پردازی کے لحاظ سے اپنا جواب آپ ہی تھے۔ اور شبلی ان سے متاثر ہوئے
بغیر نہ رہ سکے اور ان کی گپیں بھی شبلی کو وحی معلوم ہوتی تھیں۔ لیکن ان کی
ادبیت، زورِ بیان، تخیل کی کرشمہ سازی اس بلا کی تھی کہ دوسروں کے لئے
اس میدان میں قدم رکھنا ہمالہ کی چوٹی کو سر کرنا تھا۔ ان کی نثر سر تا سر شعر تھی
اور ہر بات کو تشبیہ و استعارہ کے پیرایہ میں بیان کرنا ہی ادائے بیان کا جوہر
وہ تن کی عُریانی کے قائل نہ تھے۔ بلکہ عروسِ ادب کی زلفوں کو آراستہ کرنا اور
پیرایۂ بیان کی شستگی سمجھتے تھے۔ انہوں نے زبان کو حسن بخشا۔ اور حسن کو حسنِ
کمال۔ اسی لئے شبلی جیسا ناقد بھی اعتراف کئے بغیر نہ رہ سکا۔ یہی سبب تھا کہ
آزاد کی کوئی تاسی نہ کر سکا۔ بقول محمد اکرم "شبلی کی اہمیت سرسید کے گروہ میں
ہونے کے لحاظ سے بہت اہم ہے۔ وہ عمر میں سب سے چھوٹے اور ذہانت میں کسی

...تھیں۔ ان کی دو حیثیتیں تھیں ایک عالم ہونے کے لحاظ سے اور ایک اردو کے
انشا پرداز ہونے کے سبب۔"
معلوم نہیں کیوں شبلی کی زندگی دو خانوں میں بٹ گئی؟ یا ان کی زندگی کو دو
... تقسیم کر دیا گیا۔ ان دونوں خانوں کی نقاشی دو مختلف مکاتیب فکر نے
کی ہے۔ ایک طرف ندوۃ العلماء کا گروہ ہے دوسری طرف علی گڑھ کے
... ایک کے سربراہ سید سلیمان ندوی مرحوم ہیں دوسرے کے شیخ محمد اکرام۔
... کے خیال میں شبلی سید العلماء ہیں تو دوسرے کے خیال میں عشقیہ خطوط کے
... کی نگاہ میں شبلی مجدد وقت ہیں تو علی گڑھ والوں کی نگاہ میں شبلی
... ایک کے سامنے شبلی کی زندگی عمامہ و جبہ کے ساتھ نظر آتی ہے۔ تو
... کی زندگی میں بمبئی کی رعنائیاں جلوہ فگن پاتے ہیں۔ دونوں کا نقطۂ نظر،
... انداز بیان اور پیرایۂ کلام ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ دونوں طرف
... کی حمایت میں شبلی کی صرف ایک زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔ اور
... زندگی سے رابطہ کچھ یوں ہی سا رہ جاتا ہے۔
... اس میں شبہ نہیں کہ شبلی عمامہ اور جبہ کے اندر نئی زندگی کی تڑپ رکھتے
... قدامت پسند عالم نہیں رہے تھے۔ اور سرسید کے فیضِ صحبت
... ماحول سے آشنا کر دیا تھا۔ وہ دوسرے عالموں کی طرح تنگ خیال
... سرسید کی قربت نے ان کے علم کو جلا دی تھی اور ... آزادی کو ... بنا

تنقیدیں - ڈاکٹر خورشید الاسلام

شفقتوں نے شبلی کی جولان گاہِ علمی کے میدان کو وسیع کر دیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ
سرسید جو وسعتِ قلبی لیکر آئے تھے وہ شبلی میں نہیں تھی۔ اسی لئے شبلی ریفارمر
نہ بن سکے۔ شبلی ندوۃ العلماء میں زیادہ عرصہ قیام نہ کر سکے۔ نہ علی گڑھ میں۔ لیکن
جو علمی راہیں سرسید کی رہنمائی کے سبب اُن کے سامنے کھل گئی تھیں انہوں نے
ان راہوں کو اختیار کر کے اپنے لئے ایک مقام متعین کر لیا۔

اُن کے قلم کے کھلیاں مختلف انداز میں گرتی رہیں۔ اور اہلِ نظر کو دعوتِ نظر
بھی دیتی رہیں۔ انہوں نے اپنے مافی الضمیر کی ادائیگی کے لئے نئے نئے اسلوب
اختیار کئے۔ کبھی انہیں علی گڑھ کی فکر ہے تو کبھی ندوۃ العلماء کا خیال۔ کبھی سرسید
سے ناراض ہیں تو کبھی قدامت پسند علماء سے خفا۔ کہیں اُن کے خطوط میں جلال ہے
تو کہیں جمال۔ اردو میں ان کے خطوط برنگِ شفقِ آسمانِ ادب پر چمکے اور اپنی
رنگا رنگی بوقلمونیوں سے تضاد کا رنگ جھلکتا دکھائی دینے لگا۔ کسی نے اُن کے
خطوط کو قومی اعمال نامہ کہا۔ ڈاکٹر خورشید کسی نے ان کے خطوط میں قوم کی زندگی
کے لئے تڑپ پائی۔ میں سمجھتا ہوں کہ قومی اعمال نامہ تو سرسید کے خطوط ہیں البتہ
شبلی کے خطوط سرسید کا محاسبہ ہیں۔ ان کے خطوط میں تضاد کی بڑی وجہ خود
اُن کی اندازِ طبع تھی۔ وہ کام کی ایک تڑپ رکھتے تھے۔ لیکن علی گڑھ کو جب
سراسر مغربی رنگ میں ڈوبتے دیکھا اور اپنے مشرقی علوم سے کنارہ کشی کرتے دیکھا
تو علی گڑھ میں رہنا گوارا نہ کر سکے۔ ندوۃ العلماء میں وہ علماء کو انگریزی تعلیم دینا
چاہتے تھے۔ لیکن یہاں قدامت پسندی نے اپنے پنجے اس طرح گاڑ رکھے تھے
کہ شبلی کی کچھ نہ چل سکی۔ اور تڑپ کر رہ گئے۔ انہوں نے چند تمناؤں اور آرزوؤں

کے ساتھ ندوۃ العلماء کے قیام میں حصہ لیا تھا۔ وہ امیدیں قدامت پسند علماء نے
پوری نہ ہونے دیں۔ دراصل شبلی مفاہمت چاہتے تھے لیکن شبلی اس مشن میں
کامیاب نہ ہو سکے۔

اسی لئے زندگی میں مایوسیوں کے اشارے، انشا پردازی کے جوہر کے ساتھ
زیبِ قرطاس ہوتے اور کبھی خطوط کا جواب اتنا مختصر جیسے سرکاری گزٹ۔
البتہ ان کے ادبی جوہر اور دلی تاثرات و احساسات کا اظہار اُن خطوط میں ہوتا ہے
جو عطیہ بیگم کے نام ہیں۔ جس میں لطیف استعارے اور پاکیزہ اندازِ بیان اپنی انشا
پردازی کے جوہر دکھا رہا ہے۔ شبلی نے "شعر العجم" کی نازک راہوں کو اپنے موئے
قلم سے ظاہر کیا تھا اس لئے
اُن کا دل فطرتی حسن کی جیتی جاگتی رعنائیوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ بات
صرف اتنی ہی ہوگی کہ عطیہ بیگم کے ذوقِ شعری اور لطافتِ فکر نے شبلی کو اس حد
تک متاثر کیا کہ اُن کی نظر میں عطیہ بیگم مجسم شعر بن گئیں اور بس۔
شبلی کو عمامہ و جبہ کی پابندیوں نے مجبور کر دیا تھا ورنہ نہ معلوم وہ اپنے
قلم کی جولانیوں سے رعنائی خیال کے کتنے عقدے وا کرتے۔ شیر شاہ کی طرح اُن کو
بھی اس وقت حکومت ملی جب سپیدہ سحر طلوع ہو چکا تھا۔ اور وہ متاثر ہوئے
بغیر نہ رہ سکے۔ اور اُن کا قصور صرف اتنا ہے کہ انہوں نے اپنے ذوقِ نظر کا اظہار
اپنے قلم ہی سے کر دیا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ بمبئی کی والیوں نے ان کو حسن و جمال
کی ادائیں دکھائیں جو ابھی تک ان کے ذہن میں تو تھیں لیکن نگاہ مجازی کے
سامنے نہیں آئی تھیں۔

بعض ارباب فہم کو اُن کے ظاہر و باطن کے ایک ہونے پر شبہ ہے۔ میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ شبلی بوقلمونی صفات کے مالک تھے۔ ان کے بزرگ تلوار کے دھنی تھے۔ شبلی کو اسی لئے انقلابی طبیعت ورثہ میں ملی تھی۔ لہٰذا جہاں انہوں نے بساطِ علم پر قلم کے جوہر دکھائے وہاں ان کی طبیعت نے جہاں بھی پاکیزگی، فطرت کو حسن کے ساتھ دیکھا وہاں وہ اپنی نقادانہ طبیعت کے باعث تعریف کئے بغیر نہ رہ سکے۔ شبلی کی نکتہ سنج طبیعت نے ان کو ایک دو کر ہی عالم میں پہنچا دیا۔ ندوہ کی کشمکش و اقتصادی ذہنی الجھنوں سے جب وہ گھبرا اُٹھتے تھے تو بمبئی کی حسین وادی اُن کو اپنی طرف متوجہ کئے بغیر نہ رہ سکتی تھی ؎ کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجا است۔

شبلی کے متعلق یہ بات بالکل صحیح ہے کہ وہ رومانیت[1] پسند تھے۔ اُن کی رومانیت پسندی نے ہی اُن سے شعرالعجم لکھوائی۔ اور عطیہ بیگم کے نام مکتوب لکھوائے۔

"ان کے خطوط یوں تو ملکی، قومی، مذہبی، علمی، اصلاحی خیالات کا بڑا ذخیرہ ہیں۔ لیکن ان کی نگاہوں میں خود ان کے اردو خطوط کی اہمیت نہ تھی۔ اس لئے جمع کرنے کا خیال کبھی نہیں آیا۔ البتہ فارسی خطوط کو وہ عزیز رکھتے تھے۔ ان کی تحریر حشو و زوائد سے پاک تھی، وہ لکھنے میں پہل کم کرتے تھے۔ لیکن ادبی حیثیت سے پاکیزگی حسن کا خیال رکھتے تھے، کہیں کہیں مخصوص انداز میں اس طرح لکھتے تھے جیسے سرکاری گزٹ۔ کبھی کبھی اتنا مختصر کہ صرف ہاں یا نہ پر جواب کا اکتفا کیا گیا۔ آداب و القاب کی پروا نہیں۔ خطوط کا جواب پابندی سے دیتے تھے۔ اور مختلف اشخاص سے اُن کے علمی ذوق کے لحاظ سے گفتگو کرتے تھے۔"[2]

---

[1] تنقیدیں۔ ڈاکٹر خورشید الاسلام [2] علامہ سید سلیمان ندوی۔

وہ خطوط جو شبلی کے علمی نقوش کے پس منظر تو ہو سکتے ہیں وہ مولوی حبیب الرحمان، پروفیسر عبدالقادر، حمیدالدین، عبدالماجد، مہدی الافادی کے نام ہیں جن کی علمی خوشبوؤں سے دماغ معطر ہو جائے۔ لیکن وہ خطوط جو شبلی کی زندگی کے نفسیاتی پس منظر کو پیش کریں، جو اُن کے احساسِ جمال کی نازک خیالیاں ہم پر آشکارا کریں۔ جو شبلی کے روانیٔ طبع کے دھارے کا رُخ بتائیں۔ وہ صرف مخصوص خطوط ہیں جو بقول ڈاکٹر خورشید خاصہ کی چیز ہیں۔ جن کی خاطر شبلی کو مطعون کیا گیا۔

اور ان کی زندگی پر تنقید کرنے والے اگر یہ کہتے ہیں کہ شبلی نے سرسید ہی سے کسب کمال کیا تو اس میں کوئی مبالغہ نہیں۔ لیکن یہ عرض کئے بغیر چارہ نہیں کہ انہوں نے سرسید سے وہ کسب فیض حاصل کیا۔ جو پچھلے اچھے نہ کر سکے۔ اُن کے مزاج کی بوقلمونی نے راجپوتی خون اور اسلامی رنگ کے امتزاج کو ظاہر کر دیا۔ شبلی کی انشا پردازی نے خطوط میں اپنی جرأت پسندی کو قائم رکھا اور جہاں موقع ملا ان قلم کی جولانی پھر کسی سے نہ رک سکی۔ اگر مایوسیاں شبلی کے آڑے نہ آتیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں کہ وہ مولانا آزاد[1] کی راہ اختیار کر لیتے۔ وہ زاہد خشک نہ تھے لیکن ندوۃ العلماء نے ان پر اعتراضات کئے اور آزاد طبع کہا۔ البتہ شبلی کی راہ کانٹوں کی راہ تھی۔ جس پر چلنا تمنائے آبلہ پائی کرتا تھا۔ شبلی اس راہ پر چلے اور کانٹے نکالتے رہے لیکن دل کا کانٹا نہ نکل سکا۔ اور لوگوں کے طعن و تشنیع سے وہ مایوس ہو کر اعظم گڑھ میں مقیم ہو گئے۔ ان کا راجپوتی رنگ قلم کے پیرائے کی صورت میں چمکا اور علی گڑھ کے ماحول۔ سرسید کے فیضانِ نظر نے

---

[1] شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد

اُن کے محدود علمی دائرہ کو وسعتِ قلب بخشی تھی۔ اسی لئے وہ ہر اُس چیز کے
قدرداں تھے۔ جس میں اُن کو حسن ملے، خواہ وہ مرثیوں میں ملے یا نظیر الحسن چودھری
کی کتاب المیزان میں۔ (شبلی نے دل کھول کر داد
دی۔ اُن کے قلم کی روانی نے ادب میں نئے نئے گوشے پیدا کر دیئے، تو خطوط میں
کس طرح وہ جولانیاں رک جاتیں۔ بمبئی کی حسین وادیوں نے ان کے خیال [illegible]
کی وادیوں کو وسعتِ نظر بخش دی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ شبلی کی محدودیت میں
شبہ[2] اب نہیں رہنا چاہیئے (اس لئے کہ مرنے کے بعد ہی سہی) شبلی علی گڑھ کی
آنکھ کا تارا بن گئے۔ اور علی گڑھ سے باہر اُن کی ہر تحریر علم و ادب کا گہوارہ

غبارِ خاطر ان خطوط کا مجموعہ ہے جو مولانا ابوالکلام آزاد نے قلعۂ احمد نگر
کے قید خانہ سے مولانا حبیب الرحمان شیروانی کو لکھے۔ او[illegible]
مکتوب نگار کے جیل سے باہر آنے کے بعد چھپ کر ہی شیروانی صاحب کو ملے۔
آزاد ۹ اگست ۱۹۴۲ء کی صبح کو بستر سے اُٹھے تو معلوم ہوا کہ گرفتار کر لئے [illegible]
اور اس طرح تین سال قلعہ احمد نگر میں گذارے۔ اسی دوران میں ان کے خیا[illegible]
قرطاس پر الفاظ کی شکل و صورت اختیار کرنا شروع کی۔ دماغ سے پیدا ہو[illegible]
والے خیالات صفحۂ کاغذ پر دلی تاثرات کے ساتھ زیبِ قرطاس ہوئے
اس طرح آہستہ آہستہ مکتوب نگاری نے ایک نیا روپ بدلا۔ اور ان خطو[illegible]
کی اشاعت نے اردو خطوط میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ ان خطوط کے
ہندوستان کے ایک وہ فاضل انسان تھے جنہوں نے کبھی سیاست میں

[1] مکتوب شبلی بنام نظیر الحسن چودھری [2] بقول علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم [illegible]

[illegible] حصہ نہیں لیا[1]۔ ان خطوط کا مقصدِ اولیں اشاعت نہیں تھا جیسا کہ مولانا ابوالکلام آزاد
[illegible] اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے (ہو سکتا ہے کہ خطوط کی ضخامت اور ادبی اہمیت کے
[illegible] مقصد اولیں بعد میں بن گیا ہو) بلکہ علمی و ادبی افکار کے ساتھ ایک ایسے ساتھی سے
[illegible] منظور تھا جس کو اپنے آثرات و احساسات میں شریک کر سکیں۔ اور اس کی وجہ
[illegible] تھی کہ بس ان ہی کو اس تخاطب کا اہل سمجھتے تھے۔ آزاد طبعاً عزلت پسند انسان
[illegible] نازک مزاج بھی، یہ نزاکتِ مزاجی کچھ خاندانی لحاظ سے ورثہ میں ملی تھی اور کچھ اُن
[illegible] نے خود اُن کو عوام سے دور کر دیا۔ بظاہر خطوط ایک علمی تصنیف کے برابر
[illegible] اور ان کی اہمیت وقتی ہوتی ہے لیکن غبارِ خاطر اس وقتی اہمیت رکھنے
[illegible] خطوط کا مجموعہ نہیں۔ سب سے پہلے یہ کہ "غبارِ خاطر" اُن کی زندگی کا ایک ورق
[illegible] ہے جس میں انہوں نے حقائقِ زندگی کے ساتھ دلی تاثرات، قلبی انعکاسات
[illegible] عادات، طبعی رجحانات کو جستہ جستہ خاص سلیقے سے پیش کیا ہے۔ اور پوری
[illegible] دیئے انداز میں اپنے مافی الضمیر کو واضح کر دیا۔ یہ خطوط مصنف کی
[illegible] اور جگ بیتی بھی۔ مصنف کارگاہِ حیات میں اپنے ہر اُٹھتے ہوئے قدم
[illegible] کم ہی اہمیت دیتا ہے۔ اُن کی زندگی کا ہر دن اپنے نئے انداز
[illegible] عمل کی راہیں کھول دیتا ہے۔ غالب کے خطوط ہوں یا سر سید کے،
[illegible] شان رکھتے ہوئے بھی سادگی کے حصہ غالب کو اپنائے ہوئے ہیں
[illegible] کار اردو میں نئے اسلوب تحریر کی بنیاد ہیں۔ غالباً اسی لئے کہا
[illegible] خطوط سر سید کے خطوط کا ردِ عمل ہیں۔ حقیقتاً خود ابوالکلام آزاد

[illegible] کلام [illegible] مصنف حکیم فرزانہ [2] یعنی مولانا حبیب الرحمن شیروانی

(تحریک) سرسید کا ردِ عمل ہیں۔

ابوالکلام اور غالب میں ایک معنوی مماثلت یوں پائی جاتی ہے کہ جس طرح غالب کو بلاؤں نے گھیر لیا تھا، جس کا کوئی درماں غالب جیسے ذکی الحس انسان کے پاس نہ تھا بالکل اسی طرح ابوالکلام نے خود بلاؤں کو اپنے گرد جمع کر لیا تھا، جس کا علاج سوائے خود اُن کے اور کسی کے پاس نہ تھا۔ اسی طرح دونوں کے خطوط میں بلاؤں کے نزول کی داستان تو ہے۔ لیکن ابوالکلام کی منزل زیادہ کٹھن رہی۔ فارسی کے پُر پیچ فقروں کی طرح تو فقرے اس میں نہیں نہ مسجع و مقفیٰ عبارتیں۔ لیکن فارسی کے اسلوب بیان، اور معنی آفرینی کا انداز شروع سے آخر تک ان خطوط میں قائم ہے (ہو سکتا ہے کہ ابوالکلام نے عربی، فارسی سے روگردانی کرنے والوں کو پھر اسی راہ پر لگانا چاہا ہو) اسی لئے ان میں تلمیحات ایک وسعتِ بے پایاں حد تک موجود ہے۔

ان خطوط میں زندگی کی حقیقتوں کو عوام سے الگ تھلگ رہ کر سوچنے کی کوشش کی گئی ہے جس میں نہ مبالغہ ہے اور نہ غلط بیانی، بلکہ آزادانہ اندازِ فکر ہے جو اپنی مستحکم داخلیت ہے جس میں اکثر و بیشتر جگہ حکیمانہ لہجہ شانِ انفرادیت کے ساتھ موجود ہے۔ لیکن وہ فکر کی دعوت دیتے ہیں۔ خود مسائل پیدا کرتے ہیں اور خود ہی اس کا حل سوچتے ہیں۔ ان خطوط سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ذہن انسان اپنی رسائی کے سبب کتنا بلند پرواز ہو جاتا ہے۔ ان کے مسائل اپنے مسائل ہیں اور ان کے حل سے حقیقتوں کی گرہیں کھل جاتی ہیں۔ ان کی نکتہ سنجیاں اس فلسفۂ حیات کو پیش کرتی ہیں جب بسا اوقات انسان اپنی تمام کوششوں کو قضا و قدر کے سامنے عاجز ہی دیکھتا ہے۔

یہ علمی کاوشیں، حقیقت طرازیوں اور حکیمانہ بالغ نظری کی طرف دعوتِ فکر

ہیں۔ جن سے ان کی شخصیت کا رنگ بھی جھلکتا نظر آئے گا اور ان کے قلم کی پختگی کا رنگ بھی، اُن کا جچا تلا انداز، مبالغہ آرائیوں سے دور ہے، ذہنی کیفیتیں پوری وضاحت کے ساتھ ہمارے سامنے آتی چلی جاتی ہیں۔ اس طرح انہوں نے اپنی داستان سرائی کے لئے بھی نئے انداز نکالے، اور اشاروں میں بعض جگہ تو اُن کے قلم نے وہ ادبی گُل فشانیاں کی ہیں جہاں عبارت آرائی کو دخل نہیں لیکن حقیقت کا اظہار اپنی جگہ مسلّم ہے۔ آپ ان کے فیصلوں سے اختلاف کر سکتے ہیں لیکن طرزِ استدلال سے نہیں۔

وہ خود دینی علوم کے بحرِ ناپیدا کنار، اور علمی و فکری زندگی کے ساتھ ساتھ عملی سیاست میں اتنے گہرے ڈوبے ہوئے کہ ہندوستان کی سیاسی تاریخ اُنکے ذکر کے بغیر مکمل ہی نہیں ہو سکتی۔ ان کی ذات متضاد حیثیتوں کے ساتھ ساتھ فضل و کمال کا مرکز تھی کہ علمی گفتگو میں سیاست کا نام ہی نہیں یا گویا آزاد کو اس سے کچھ کام نہیں۔ یہ غالباً شبلی کا اثر تھا کہ انہوں نے بھی اپنی زندگی کو مختلف خانوں میں بانٹ لیا تھا اور ایک خانے کا اثر دوسرے خانے پر پڑنے نہیں پاتا تھا۔

اُن کی ادبی زندگی، سیاسی زندگی سے پہلے شروع ہوئی اور باوجودیکہ سیاسی زندگی آہستہ آہستہ اُن کے زندگی کے تمام عناصر پر چھا گئی۔ لیکن اس کے باوجود اُن کی شخصیت، تقریر و تحریر کے اعتبار سے بھی ادب و شعر کی محفلوں کو گرماتی رہی اور فلسفیانہ علمی کاوشوں کے سبب اعلیٰ ذہنی سطح کے لوگوں سے تحسین و آفرین کا تمغۂ امتیاز حاصل کرتی ہی رہی۔ اور سب اُن کے فضل و کمال سے بقدر حوصلہ مستفید ہوتے ہی رہے۔

ان خطوط سے ایک بات اور یہ واضح ہوتی ہے کہ وہ پورے اطمینان کے
ساتھ زندگی کے تمام مختلف شعبوں میں دلچسپی کا اظہار کرتے رہے اور سیاسی زندگی
کے حوادثات ان کے علمی معرکوں، فلسفیانہ غور و فکر، شعر و سخن کی بزم آرائیوں
یا ادب و انشاء کی سخن طرازیوں میں کسی طرح حائل نہیں ہوتے۔ وہ اپنی
مجلسوں کا مزہ بدلنے کے لئے مختلف انداز سے تحریر و تقریر کے نئے نئے
گوشے پیدا کرتے ہیں اور اپنے ہم مذاق دوستوں سے اس قسم کے مواقع پر اپنی
گفتگو کے ذریعہ یا غائبانہ طور پر گردشِ قلم کی جولانی کے سبب نئے انداز کی ہی
گفتگو کرتے ہیں۔ چائے ان کی مرغوب و محبوب ہمنشین ہے۔ اس کی خوبیاں
عجیب و غریب انداز میں ان کے دل نشیں ہیں۔ لیکن اس چائے سے متنفر ہیں
جو یہاں رائج ہے۔ بلکہ یہاں بھی ان کی انفرادیت چائے کی خاص الخاص قسم
تلاش کر کے نئے انداز سے پیتی ہے اور جس میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہو سکتا۔
اس لئے کہ اس کی تلخی اوروں کے لئے جاں گسل ہے اور ان کے لئے جانفزا۔
اس کی تلخی ان کی جولانیٔ طبع میں اضافہ کرتی ہے۔ گویا چائے "شراب" کی
چھوٹی بہن ہے۔

بقول ناظر کاکوری ان کا طرزِ تحریر اور اندازِ بیان مخصوص اشارات کا
حامل ہے۔ اسی لئے عام اسلوب سے کوئی مماثلت نہیں رکھتا۔ پیش پا افتادہ
چیزوں کو فصاحت و بلاغت کے نئے انداز سے اس طرح پیش کرتے ہیں کہ میر
انیس نے یہ مصرعہ بالکل اُن ہی کے لئے کہا تھا ع لگا دیئے ہیں مضامینِ نو کے پھر
انبار۔

عام دینی مباحث میں وہ صفحوں کے صفحے لکھ جائیں گے، اور ایک شعر بھی
نہیں آئے گا۔ لیکن اس ادبی تحریر میں آپ کو کثرت سے اشعار ملیں گے۔ اس
طرح نثر میں شعر کا جوڑنا انگوٹھی پر نگینے کا کام دیتا ہے۔ دلائل کا زور کہیں بھی
گھٹنے نہیں پاتا۔ تسلسلِ فکر کے ساتھ اسلوبِ بیان کی جدت ایک نیا رنگ
پیدا کرتی ہے اور تقلیدِ عام سے الگ ہو کر وہ الفاظ و تراکیب سے مطالب کو ایک نئے
انداز میں پیش کرتے ہیں۔ اسی لحاظ سے ان میں اور غالب میں مماثلت معنوی ہے
غالب کی طرح انھیں بھی یہ گوارا نہیں کہ کسی دوسرے کے نقشِ قدم پر چلیں۔ اُن کی
شگفتہ و شائستہ تحریریں فکر کی دعوت دیتی ہوئی اسلوبِ بیان کے ایک نئے طرز کو
اپنا لی ہیں۔

انھوں نے مولانا حبیب الرحمٰن شروانی کو ایک خط میں لکھا کہ "میری دکانِ سخن
میں اس قماش کی جنس نہیں رہتی۔ لیکن آپ کے لئے جب کچھ نکالتا ہوں تو
چھلنی میں چھان لیتا ہوں تاکہ کسی طرح کی سیاسی ملاوٹ باقی نہ رہے۔"
انھیں اس امر کا اعتراف ہے کہ جو چیزیں وہ پیش کرتے ہیں وہ عوامی تقاضوں
کے مطابق نہیں ہوتی ہیں لیکن اسی انداز پر انھیں فخر بھی ہے۔ وہ خود لکھتے ہیں۔
"بازار میں ہمیشہ وہی جنس رکھی جاتی ہے جس کی مانگ ہوتی ہے۔ اور چونکہ
مانگ یہی ہے اس لئے ہر ہاتھ اُس کی طرف بڑھتا ہے، ہر آنکھ اُسے قبول کرتی
ہے۔ میرا معاملہ اس سے بالکل الٹا رہا۔ جس جنس کی عام مانگ ہوئی میری دکان
میں اس کی جگہ نہ نکلی۔ لوگ زمانے کے روز بازار میں ایسی چیزیں ڈھونڈھ کر لائیں گے
جو عام ہوں۔ میں نے ہمیشہ ایسی چیزیں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر جمع کیں جن کا

کہیں رواج نہ ہو۔ اوروں کے لئے پسند و انتخاب کی جو علت ہوئی وہی میرے
لئے ترکِ و اعراض کی علت بن گئی۔ انہوں نے دوکانوں میں ایسا سامان سجایا
جس کے لئے سب کے ہاتھ بڑھیں۔ میں نے کوئی چیز ایسی رکھی ہی نہیں جس
کے لئے سب کے ہاتھ بڑھ سکیں۔

قماشِ دست زدہ شہر و دہ زمن مطلب
متاعِ من ہمہ دریائی است یا کانی

لوگ بازار میں دکان لگاتے ہیں تو ایسی جگہ ڈھونڈھ کر لگاتے ہیں، جہاں
خریداروں کی بھیڑ لگی ہو۔ میں نے جس دن اپنی دکان لگائی تو ایسی جگہ ڈھونڈھ کر
لگائی جہاں کم سے کم گاہکوں کا گذر ہو سکے۔"

(غبارِ خاطر ص ۱۱۵)

ان کے خطوط کی ایک اور خصوصیت جو نظر کے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ
جب بھی زندگی کی تلخ حقیقتیں اپنے اصلی رنگ میں سامنے آئیں تو انہوں نے
اس کے تجربات اور تاثرات کو جابجا اپنے خطوط میں ظاہر کر دیا۔ وہ حقیقت
کو حقیقت سمجھتے تھے، اسی لئے اپنے سینے کو حوادثِ زندگی کے تیروں کا
نشانہ بننے کے لئے آگے بڑھا دیا اور خندہ پیشانی سے ان تکلیفوں کا خیر مقدم
کیا کہ خود ان تکلیفوں کی اہمیت ختم ہو گئی۔ وہ ناکامیوں سے ہراساں نہیں ہوئے
بلکہ مشکلات کو صبر کے ساتھ برداشت کیا۔ اسی لئے اسی قسم کے فقرے ان کے
خطوط میں جابجا ملیں گے جو ان کی تجرباتی زندگی کا نچوڑ ہیں۔

"یہاں پانے انہیں کو مزہ مل سکتا ہے جو کھونا جانتے ہیں۔"

زندگی کے فلسفہ کو ادبی نکتہ سنجیوں کے ساتھ حل کر کے پیش کرنا صرف ان کی
ہی خصوصیت ہے۔ زندگی اپنی جگہ صرف پھولوں کی سیج نہیں بلکہ کانٹوں کا راستہ
بھی ہے۔ اسی راستہ پر چلنا اور آبلہ پائی کی فکر نہ کرنا ہی تقاضائے دانشمندی ہے اور
اس جانگداز و جاں گسل وادی کو حوصلہ مندی سے طے کرنا۔ غم سہنا اور ہنسنا ہی
اہم کام ہے۔ اب ذرا آزاد کی زبانی سنئے "اگر آپ نے یہاں ہر حال میں خوش
رہنے کا ہنر سیکھ لیا تو یقین کیجیے کہ سب سے بڑا کام سیکھ لیا ہے۔ اب
اس کے بعد اس سوال کی گنجائش نہیں رہی کہ آپ نے اور کیا کیا سیکھا۔ خود
بھی خوش رہیئے اور دوسروں سے بھی کہتے رہیئے کہ اپنے چہروں کو غمگین نہ بنائیں۔"

"چو مہمانِ خراباتی، بعشرت باش با رنداں
کہ دردِ سر کشی جاناں، گر ایں مستی خمار آید" غبارِ خاطر ص ۹۲

وہ اپنے تاثرات کا اظہار ایسے دلنشیں انداز سے کرتے ہیں کہ جس میں سادگی کے
ساتھ پرکاری شاملِ حال رہتی ہے۔

گرفتاری سے پہلے جب وہ کلکتہ سے روانہ ہوئے تو ہمشیرہ کی خاموشی اور
انداز نگاہوں نے شاید اشارہ کیا ہوگا کہ یہ آخری ملاقات ہے۔ لیکن انتقال
کے بعد تمام پچھلے واقعات کو فلم کی طرح نظر کے سامنے پیش کر دیا۔ اور اسی
انداز میں جاذب، دلکش پیش کیا۔ جس میں زبان کی متانت سے روکھے پھیکے
اندازِ بیان نہ اس میں دوسروں کے لئے غیر دلچسپی پیدا ہوئی۔

"اس طرح کے حالات پر مجھ سے زیادہ زلیخا[1] کی نظر رہا کرتی تھی، اس نے وقت کی صورتِ حال کا پوری طرح اندازہ کر لیا تھا۔ . . . . وہ میری افتادِ طبیعت سے واقف تھی، وہ جانتی تھی کہ اس طرح کے حالات میں ہمیشہ میری خاموشی بڑھ جاتی ہے۔ لیکن ہم دونوں کی خاموشی بھی گویائی سے کم نہیں تھی، ہم دونوں خاموش رہ کر بھی ایک دوسرے کی باتیں سن رہے تھے۔ ۳ راگست کو جب میں بمبئی کے لئے روانہ ہونے لگا تو حسبِ معمول دروازہ تک خدا حافظ کہنے آئی۔ میں نے کہا۔ اگر کوئی نیا واقعہ پیش آگیا، تو ۱۳ راگست تک واپسی کا قصد ہے۔ اس نے خدا حافظ کے سوا کچھ نہ کہا۔ لیکن اگر وہ کہنا بھی چاہتی تو اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتی تھی، اس کے چہرہ کا خاموش اضطراب کہہ رہا تھا اس کی آنکھیں خشک تھیں مگر چہرہ اشکبار تھا۔

ع خود را بجائے پیش تو خاموش کردہ ایم

گذشتہ پچیس سال کے اندر کتنے ہی سفر پیش آئے، اور کتنی ہی مرتبہ گرفتاریاں ہوئیں، لیکن میں نے اس درجہ افسردہ خاطر اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کیا یہ جذبات کی وقتی کمزوری تھی، جو اس کی طبیعت پر غالب آگئی تھی؟ میں نے ایسا ہی خیال کیا۔ لیکن اب سوچتا ہوں (انتقال کی خبر سننے کے بعد) تو خیال ہوتا ہے کہ شاید اسے صورتِ حال کا ایک مجہول احساس ہونے لگا تھا۔ شاید وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس زندگی میں یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ وہ خدا حافظ

---

[1] بیوی

اس لئے نہیں کہہ رہی تھی، کہ میں سفر کر رہا تھا وہ اس لئے کہہ رہی تھی کہ وہ خود سفر کرنے والی تھی۔

آگے چل کر ایک غم انگیز انداز میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہیں۔ الفاظ دل میں در کرنے والے تیر ہیں جن سے حقیقت و سچائی کا اظہار اس طرح چھن چھن کر ہو رہا تھا کہ ہم بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ یہی وقت انسان کے لئے ایک کٹھن وقت ہوتا ہے اور ایک کڑی منزل۔

اپنے غم کا اظہار کرنے کے لئے آخر وہ الفاظ کہاں سے لائے۔ اس لئے کہ الفاظ سے پھر بھی غم کا ایک دائرہ محدود ہو جاتا ہے۔ اور غم لامحدود اثر دل و دماغ پر ڈالتا ہے۔ یہی منزل بھاری منزل ہے جب برسوں کا ساتھ دینے والا ہمدم و ہمراز، خوابِ شیریں کا ساتھی اور غم آگیں وقت کا بھی جیون ساتھی۔ غم کی نیا کھینے والا، خود اس طوفانِ حوادث کا شکار ہو جائے جس نے پیمانِ محبت باندھ کر اس کو پوری طرح نبھایا ہو اور اس طرح کہ جس کا کبھی جادۂ وفا سے قدم نہیں ڈگمگایا ہو۔ جس کی زندگی کسی کے چشم و ابرو کے اشاروں پر چلنے میں گزر گئی ہو جس کے لئے جیون ساتھی مرکزِ محبت، آسمانِ الفت اور ذریعۂ نجات بھی ہو۔ وہ اگر آخری ملاقات کے بعد اس طویل سفر پر روانہ ہو جائے جہاں سے بازگشت ممکن ہی نہیں۔ تو اس کا دل پر گزر جائے وہ بھی تھوڑا ہے۔

جونہی خطرناک صورتِ حال کی پہلی خبر ملی، میں نے اپنے دل کو ٹٹولنا شروع کیا۔ انسان کے نفس کا بھی کچھ عجیب حال ہے۔ ساری عمر ہم اس کی دیکھ بھال کر دیتے ہیں پھر بھی یہ معمہ حل نہیں ہوتا۔ میری زندگی ابتدا سے ایسے حالات

گزری کہ طبیعت کی ضبط و انقیاد میں لانے کے متواتر موقع پیش آتے رہے۔ اور
جہاں تک ممکن تھا ان سے کام لینے میں کوتاہی نہیں کی۔

تا دست رسم بود۔ زدم چاک گریباں
شرمندگی از خرقۂ پشمینہ ندارم

تاہم میں نے محسوس کیا کہ طبیعت کا سکون ہل گیا ہے اور اسے قابو میں رکھنے کے
لئے جد و جہد کرنی پڑے گی۔ یہ جد و جہد دماغ کو نہیں مگر جسم کو ضرور تھکا دیتی ہے۔
وہ اندر ہی اندر گھلنے لگتا ہے۔

اس زمانے میں میرے دل و دماغ کا کیا حال ہوا میں اسے چھپانا نہیں چاہتا۔
میری کوشش تھی کہ اس صورتِ حال کو پورے صبر و سکون کے ساتھ برداشت کر سکوں۔
اس میں میرا ظاہر کامیاب ہوا۔ لیکن شاید باطن نہ ہو سکا۔ میں نے محسوس کیا کہ اب
دماغ کی بناوٹ اور نمائش کا وہی پارٹ کھیلنے لگا ہے جو احساسات اور
انفعالات کے ہر گوشہ میں ہم ہمیشہ کھیلا کرتے ہیں اور اپنے ظاہر کو باطن کی طرح
نہیں بننے دیتے۔ سب سے پہلی کوشش یہ کرنی پڑی کہ یہاں زندگی کی جو روزانہ
معمولات ٹھہرائی جا چکی ہیں، ان میں فرق نہ آنے پائے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں اعتراف
کرتا ہوں کہ یہ تمام ظاہر داریاں دکھاوے کا ایک پارٹ تھیں جس سے دماغ کا
معزورانہ کھیلتا رہتا تھا، اور اس لئے کھیلتا تھا کہ کہیں اس کے دامنِ صبر و وقار
پر بدحالی اور پریشان خاطری کا کوئی دھبہ نہ لگ جائے۔ بدہ یارب دلے، کیں
صورت بیجاں نمی خواہم۔

بالآخر ۹ اپریل کو زہرِ غم کا یہ پیالہ لبریز ہو گیا۔

نان ماتحذرین، وقد وقع

اس طرح ہماری چھتیس ۳۶ برس کی ازدواجی زندگی ختم ہو گئی اور موت کی دیوار ہم
دونوں میں حائل ہو گئی۔ ہم اب بھی ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں۔ مگر اسی دیوار کی
اوٹ سے۔

مجھے ان چند دنوں کے اندر برسوں کی راہ چلنی پڑی ہے۔ میرے عزم نے
میرا ساتھ نہیں چھوڑا۔ مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ میرے پاؤں شل ہو گئے ہیں۔

غافل نیم ز راہ، ولے آہ چارہ نیست
زیں راہزناں کہ ہر دل آگاہ می زنند"

آزاد بے کم و کاست اپنے غمگیں دل اور پریشان حالی کا جو نقشہ اپنے خط میں
کھینچا ہے وہ اپنی جگہ انتہائی طور پر تاثیر انگیز بھی ہے اور چشم کو نمناک کرنے والا بھی۔
جس بیان میں اشاروں میں پوری حقیقت بیان کر دی۔ رفیقِ حیات کا اس
عالمِ فرقت میں ساتھ چھوڑنا اور اس پر آزاد کی قیدِ تنہائی۔

ع نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے
گھٹ کے مر جاؤں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے

علمی و ادبی نقطۂ نظر سے قطع نظر خود مولانا کے احساسات، ان کی شخصیت، ان
کی طبیعت کے رجحان کا پوری طرح ان خطوط سے پتہ چلتا ہے۔ اسی لئے تذکرہ کی
نسبت آزاد کی افتادِ طبع، ان کے تعلیمی ماحول، خانگی امور بالخصوص شریکِ حیات
کے تاثرات کا زیادہ اندازہ غبارِ خاطر سے ہو جاتا ہے۔ ان کا خود نقطۂ نظر، ان کے
دینی قیودات سے علیحدگی۔ آزادانہ روش کا انتخاب۔ پیری مریدی سے چھٹکارا۔

گو یہ سب چیزیں اشاروں میں ملتی ہیں لیکن ان سے پھر بھی خود اپنے قلم سے جو ایک تصویر نظر کے سامنے آتی ہے وہ بھی واضح اور صاف ہوتی ہے۔

بقول مہر "غالب کے بعد صرف آزاد میں وہ دلکش خصوصیات جامعیت کے ساتھ ہیں جو کسی میں نہیں پائی جاتی۔ اُن کا دائرۂ علم و فضل غالب کے مقابلہ میں بہت وسیع ہے۔" غالب از صفحہ ۴۶۳

خطوط کی طوالت سے بے ساختگی پیدا تو نہیں ہو سکتی البتہ خطوط علمی اشاروں کا سہارا بن گئے۔ انہوں نے ہمیشہ صدیق مکرم سے خط شروع کیا۔ آخر میں کوئی فارسی یا عربی شعر مناسبتِ تحریر کے لحاظ سے ایسے جڑ دیئے گئے ہیں جیسے انگوٹھی میں نگینہ اور ابوالکلام لکھ کر خط ختم کیا۔

گویا ان کے خطوط سے سینکڑوں علمی نکات کا پتہ بھی چلتا ہے۔ اور ابوالکلام کی علمی گہرائی اور گیرائی کا بھی۔ یہ بالکل درست ہے کہ ان کے خطوط مقالہ ہی بن گئے ہیں اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ابوالکلام آزاد نے از خود یہ گفتگو کی صورت پیدا کی ہو اور فرضی مکتوب الیہ کی صورت میں قیدِ تنہائی نے اس گفتگو کو اور بھی طویل کر دیا ہو۔ جبکہ ابوالکلام کے قلم کی جولانیاں ساتھ دینے کے لئے تیار بھی ہوں۔

آزاد چونکہ قید میں تھے اس لئے وہ دوسروں کے دکھ درد میں شریک تو نہیں ہو سکے۔ البتہ خود ان خطوط کی اشاعت نے دوسروں کو (قید کے بعد ہی سہی) اپنے غم میں شریک کر لیا۔ اس طرح آزاد نے مکتوب نویسی کے ذریعہ غم کو بہلایا بھی اور بھلایا بھی۔

غالب اپنے خطوط میں اکثر و بیشتر مرتبہ اپنی سطح سے نیچے آجاتے ہیں لیکن آزاد کے ہاں یہ صورت حال ممکن نہیں۔ وہ علم کی بلند ترین فضاؤں میں پرواز کرتے چلے جاتے ہیں اور اس دنیا سے الگ ہونا اُن کے لئے ایک اور ذریعہ علیحدگی بن جاتا ہے۔ اُن کے ان خطوط میں سنجیدگی کی تان کہیں نہیں ٹوٹتی۔ علمی شہرت، سیاسی وجاہت نے جو رتبہ انہیں بخش دیا تھا اس کے باعث عوام سے دور ہو گئے۔ اس تنہائی پسندی میں آخر کو رفیقِ حیات کی تو ضرورت ہے۔ چنانچہ انہوں نے "جیل کی یکسانیت پر اپنے دل کی رنگینی، اور طبیعت کی زنگارنگی پر قابو پانے کی کوشش کی ہے۔ وہ دل کو مردہ نہیں ہونے دیتے۔ کبھی بادۂ تریاق کبھی زاغ و بلبل اور کبھی چائے نوشی سے زندان کو شبستان بنا لیتے ہیں۔"

(پروفیسر احمد فاروقی)

اقبال

انسانی خطوط ذاتی تاثرات اور اُن شدید جذبات کا عکس ہوتے ہیں جن
میں انسان اپنے خیالات کا صحیح عکس مختصر سے مختصر الفاظ میں پیش کرتا ہے۔
میں خطوط کی اہمیت مکتوب نگار کی ذات کے اعتبار سے قائم کی جاتی ہے۔
در اصل مکتوب نگار اپنے خطوط میں خود اپنی اہمیت قائم کر لیتا ہے، اور اس کی
شخصیت کا مرکزی تصور ذہن میں مرتسم ہو جاتا ہے اور خطوط اس کی شخصیت
مجرد خاکے بن جاتے ہیں۔ جس طرح تجریدی آرٹ میں مصور کی شخصیت،
تاثر جھلکتا ہے، اسی طرح خطوط کے الفاظ بھی وہ لکیریں ہیں جن کے سمجھنے
ہماری فکر کی رسا اگر ہماری مددگار نہ ہو تو سوائے الفاظ کے اور کچھ معلوم
ہو سکے گا۔

تحریر نہ صرف اپنے لئے دوامی حقیقت رکھتی ہے بلکہ خود صاحب
بھی دوام بخشتی رہتی ہے۔ گویا تحریریں کسی کی شخصیت کا وہ مثالی خاکہ ہیں
ہم انشا پرداز کو شیشے کی اوٹ میں سے پوری طرح دیکھ سکتے ہیں۔ البتہ
اگر صاف و شفاف نہ ہو تو پھر شخصیتیں اپنی صاف و شفاف صورتوں کے

ہماری نگاہ میں نہ سما سکیں گی۔ اردو ادب میں خطوط نویسی کے اگر تمام ممکنہ
مجموعوں پر نظر ڈالیں تو شاید گنتی کے ہی ایسے افراد نظر آئیں گے جن کے خطوط اُن
کی اپنی زندگی کا آئینہ نہیں بلکہ قوم کے تاثرات کا عکس ہیں۔ اُن کی سچی تڑپ
اُن کا خلوص، اُن کا جذبۂ ایثار، قوم کی فلاح و بہبود کے لئے وقف ہو گیا ہو۔
اور جب ان کے وہ تاثرات پردۂ خفا سے باہر آ جائیں تب ہی پتہ چلتا ہے
کہ کس طرح ان کی زندگی کے قیمتی لمحے اپنے فائدوں کے لئے نہیں بلکہ قوم کے لئے
وقف تھے۔

آئیے اب اقبالؔ کو ان کے خطوط کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کریں۔ کہا
جاتا ہے کہ اقبال گفتار کے غازی تو تھے مگر کردار کے غازی نہ بن سکے۔ لیکن اگر قلم
کے جوہر کی طاقت تلوار کے جوہر سے زیادہ پُر اثر ہے یا اس کا زور ہم تلوار کے
زور سے زیادہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ اُنھوں نے زبان کے لطف یا وقتی طور سے مخاطب
کو خوش کرنے کے لئے خط نہیں لکھے، ان کی نظر کے سامنے سر سید کی طرح مسلمانوں
کی عموماً اور ہندوستانی مسلمانوں کی خصوصاً فلاح و بہبود کے مقاصد تھے۔ انہوں نے
موقع پر اپنے خطوط سے مسلمانوں کے اندرونی تفرقوں کو دور کرنے کی کوشش
ایک زمانہ میں سر سکندر مرحوم قائدِ اعظم سے معاہدہ کرنے کے باوجود خود مسلمانوں
کی متحدہ طاقت (پنجاب میں) توڑنے کی فکر میں تھے۔ ڈاکٹر صاحب چونکہ خود لاہور
میں مقیم تھے اس لئے اس سرگرمی کا پوری طرح پتہ چل جاتا تھا۔ چنانچہ اس صورتِ حال
کی قائدِ اعظم کو خبر دی، اقبال سیاسی افکار کے عملی جامہ پہنانے اور انہیں کامیاب
سلسلہ میں صرف قائدِ اعظم ہی کو اس کا اہل سمجھتے تھے۔ چنانچہ جس قدر

قائد اعظم اپنے خلوص اور اخلاقی جرأت کے سبب کانگرس کی نگاہ میں کھٹکتے تھے،
اتنا ہی اقبال کا ان پر کامل بھروسہ تھا۔ اقبال مرحوم نے کانگرس کی مختلف سرگرمیاں
اور قائد اعظم کا کردار، دونوں بیک وقت دیکھ کر یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ مسلمانوں کی
تہذیب اور ان کے مستقبل کو بچانے کے لئے صرف ایک ہی مردِ آہن ہے اور وہ
قائد اعظم ہیں (یہ وہ زمانہ تھا جب مسلم لیگ بحیثیت جماعت مسلمانوں کی اکثریت کے
صوبوں میں برائے نام تھی، اور اقلیت کے صوبوں میں سرگرمی سے کام کر رہی تھی)
انہوں نے اپنے خطوط کے ذریعے قائد اعظم کو لیگ کے پروگرام اور دستور میں
تبدیلیوں کی طرف توجہ دلائی تاکہ مسلم لیگ صحیح معنوں میں عوام کی نمائندگی کا حق
ادا کر سکے۔ ایک خط میں انہوں نے لکھا "میرا ذاتی خیال ہے کہ وہ سیاسی جماعت
جو عام مسلمانوں کی بہبودی کی ضامن نہ ہو، عوام کے لئے باعثِ کشش نہیں ہو سکتی۔"
مسلم لیگ کو عوامی جماعت بنانے کے سلسلے میں انہوں نے واضح انداز میں قائد اعظم
کی توجہ مبذول کی۔ یہ وہ مشکل کام تھا کہ جو دوسروں کے لئے مشکل ہی نہیں، بلکہ
ناممکن تھا۔

اقبال کے یہ چند خطوط قائد اعظم کے نام اپنی تعداد کے لحاظ سے تو زیادہ نہیں۔
لیکن اپنی افادیت کے لحاظ سے اہم ترین ہیں۔ پاکستان کی بنیاد اور اس کی تاریخ
میں قائد اعظم کے عمل کے ساتھ اقبال کے خطوط کی اہمیت اور بھی واضح ہو جاتی
ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ اقبال صاحب فراش ہو چکے تھے، لیکن اس بیماری کے
عالم میں بھی صیغۂ راز میں قائد اعظم کو برابر اپنے قلم سے خطوط لکھتے رہے۔ ۱۹۳۷ء میں
انہوں نے واضح طور سے اس بات کا اظہار کر دیا تھا کہ "اس وقت مسلمانوں کو

اس طوفانِ بلا میں جو شمال مغربی ہندوستان اور شاید ملک کے گوشے گوشے سے اٹھنے
والا ہے، صرف آپ ہی کی ذاتِ گرامی سے رہنمائی کی توقع ہے۔"
اس زمانے میں جو ہندو اکثریت والے صوبوں میں فساد ہوئے تو اقبال نے
قائد اعظم کو لکھا کہ "مسلمانوں کی اکثریت کے صوبوں میں بھی ہندوؤں اور سکھوں کا
اور مسلمانوں پر ہراس طاری کرتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہم فی الحقیقت خانہ جنگی
میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ فوج اور پولیس موجود نہ ہو تو یہ خانہ جنگی چشم زدن میں
[illegible] ہو جائے۔"
۱۹۳۵ء کا ایکٹ جو قانونی اعتبار سے ہندو آبادی کی اکثریت کے لئے مفید
اور مسلمانوں کو نظر انداز کر دینے کے لئے بنایا گیا تھا، اقبال نے بھی قائد اعظم کو اس
کی خامیوں کی طرف متوجہ کیا۔ اور قائد اعظم بھی اس زمانہ کے فرقہ وارانہ
حالات کو دیکھتے ہوئے اس فیصلہ پر پہنچ گئے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کو اپنی
[illegible] سیاسی طور پر علیحدہ تسلیم کرنے سے انکار کر رہا تھا۔ ادھر نومبر میں سکندر
[illegible] لیگ سے معاہدہ کرنے کے بعد خود پنجاب میں لیگ کو شکست دینے کی
[illegible] اور مسلم لیگ کے لکھنؤ کے اجلاس کے بعد واپسی پر زمیندارہ لیگ کی
[illegible] صوبہ بھر میں اس کی شاخیں قائم کیں، تو اقبال مرحوم نے قائد اعظم کو
اپنے خط کے ذریعہ اس اندرونی سازش سے مطلع کیا اور ان سے رائے
[illegible] کی "مطلع فرمائیے کہ اندریں حالات ہمیں کیا کرنا چاہئے۔"
اقبال مرحوم کی فراست تھی کہ اس پر آشوب دور میں انہوں نے ایک
[illegible] کو مرکز نگاہ لیا جو مسلمانوں کے لئے باعثِ نجات بن گیا۔ خدا ان کی ہزار

ہزار رحمتیں ان دونوں پاک روحوں پر نازل فرمائے۔

قائدِ اعظم کے نام جو خطوط لکھے گئے۔" وہ ان کے اس قومی نقوش مجـ[illegible]
کے تاثرات کا عکس ہیں جو ان کی نگاہِ دوربین نے مسلمان اور اسلام کے مستقـ[illegible]
کے لئے خطوط کے ذریعہ ظاہر کئے۔ اور واضح طور سے ان کا تعین بھی کیا جـ[illegible]
پر پاکستان کی تشکیل کئے جانے کے امکانات کا جائزہ لیا جا رہا تھا۔

اقبال کے خطوط قائدِ اعظم جناح کے نام ملت کے متعلق پیش گوئیاں تھیـ[illegible]
جو حرف بحرف درست ہو رہی تھیں اور بعد میں وہ روزِ روشن کی طرح سا[illegible]
آگئیں۔ دونوں کے تاثراتِ قلبی کا اندازہ اب اُن حالات سے دور ہو کر[illegible]
طور سے ہوتا ہے کہ ان دونوں میں مسلمانوں کے مستقبل کے لئے کتنی تڑپ موجود[illegible]

ایک خط میں انہوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کے مستقبل کے متعلق جو اند[illegible]
تھے، اگر وہ کہیں خدانخواستہ پورے ہو جاتے تو کیا حال ہوتا۔ انہوں نے لکھا[illegible]
"مجھے ڈر ہے کہ ایسا نہ ہو کہ ان کی زندگی (مسلمانوں کی) گونڈ اور بھیل اقوام
کی طرح ہو کر رہ جائے۔ اور رفتہ رفتہ اُن کا دین اور کلچر اس ملک میں فنا
ہو جائے اور مسلمانوں اور اسلام کا مستقبل اس ملک میں تاریک ہو جا[illegible]
اگر ان مقاصد کی تکمیل کے لئے مجھے اپنے کام چھوڑنے پڑیں، تو انشاء ا[illegible]
چھوڑ دوں گا، اور اپنی زندگی کے باقی ایام اسی ایک مقصد جلیل کے لئے وقف
کر دوں گا۔"

اسلامی شریعت کی ترویج کے لئے وہ کس طرح بے چین تھے، اس کا
اندازہ اس خط سے لگائیے جو انہوں نے قائدِ اعظم کو ۱۹۳۷ء میں لکھا۔ اد[illegible]

[illegible] بتائی کہ جواہر لال کی اشتراکیت مسلمانوں کو افلاس سے نجات نہیں دلا سکتی۔
[illegible] فرض لیگ کا ہے کہ وہ مسلمانوں کو افلاس سے نجات دلانے کے لئے
[illegible] کوشش کرے۔ ورنہ مسلمان عوام پہلے کی طرح اب بھی لیگ سے بے تعلق
[illegible] رہیں گے۔ اور اس کا واحد علاج صرف شریعتِ اسلامیہ کا اجرا ہے۔
اگر اسلامی قانون کو معقول طریقہ پر سمجھا اور نافذ کیا جائے تو ہر شخص کو کم از کم
[illegible] معاش کی طرف سے اطمینان ہو سکتا ہے۔" اسی کے ساتھ انہوں نے
[illegible] اعظم کے سامنے شریعتِ اسلام کے نقطۂ نظر سے سوشل ڈیموکریسی کو اسلامی
[illegible] ستان میں رائج کرنے کے لئے تجویز پیش کی اور وہ قائدِ اعظم جیسے ماہر
[illegible] سے اس خیال کی تائید کرانا چاہتے تھے کہ "کیا آپ کی رائے میں اس مطالبہ
[illegible] نہیں آن پہنچا۔"

قائدِ اعظم کی ذات پر جو انھیں پورا بھروسہ تھا۔ اس کا اظہار صاف طور
[illegible] کیا تھا کہ "اسلامی ہندوستان کو امید ہے کہ اس نازک دور میں آپ کی
[illegible] اور فراست ہی ہماری موجودہ مشکلات کا کوئی حل تجویز کر سکے گی۔"

[illegible] اقبال کا دل قومی و ملی محبت کا وہ چھلکتا پیمانہ تھا جس کے تاثرات صرف
[illegible] کی بہتری اور بہبود کے علاوہ اور کچھ کہتے ہی نہیں۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

[illegible] افسوس تو اس امر کا ہے کہ بقول قائدِ اعظم "اقبال" اس خواب کی تعبیر اپنی زندگی
[illegible] سکے۔

[illegible] کی خصوصی تعلیم علومِ اسلامیہ کے متعلق ہوئی تھی۔ انہوں نے اپنے

یام یورپ کے دوران تمام اسلامی تحریکات کا بغور مطالعہ بھی کیا تھا۔ اگرچہ
ظاہری ماحول کے اعتبار سے ان کی تعلیم مغربی اندازِ فکر میں ہوئی تھی۔ لیکن عج
بات یہ ہے کہ جس قدر انہوں نے مغربی علوم کی روشنی میں اسلامی علوم کا مطالعہ
کیا، وہ اتنا ہی زیادہ مغرب سے دور اور مشرق سے قریب تر ہوتے چلے گئے
بظاہر یہ ایک عجیب بات ہی معلوم ہوتی ہے کہ مغربی ماحول میں آنکھیں کھو
والا، اسی مغربی ماحول کے استادوں کے سامنے زانوئے ادب طے کرنے والا
اسی قوم کی عیاریوں کا پردہ چاک کرے، لیکن اقبال مقلد نہ تھے، محقق تھے
زمانہ ہی بتلائے گا کہ وہ مجددِ وقت بھی ثابت ہوئے یا نہیں۔ لیکن اس پُرخطر
راہ کو انہوں نے سب سے پہلے طے کیا۔ جہاں پاؤں کا زخمی ہونا تو کوئی بات ہی
بلکہ دل میں آبلے پڑ جاتے ہیں۔

اکبر اسی لئے اقبال کی نگاہ میں عزیز تھے۔ کہ ان کے اشعار نے طنز و مزاح
ذریعہ مغربی تہذیب کے کھوکھلے پن کو نمایاں کرکے دکھا دیا۔ اور اپنی نشتر زنی
کوئی کسر نہ چھوڑی۔

"میرے اسلام کو ایک قصۂ ماضی سمجھو
ہنس کے وہ بولی کہ پھر ہم کو بھی راضی

نہ صرف فنِ شاعری اور ادبی مباحث کے سلسلے میں لسان العصر اکبر سے راہ و رسم
سلسلہ جاری تھا۔ بلکہ اُن کی مغربی طرز کی تقلید پر انتہائی طور سے نکتہ چینی کے
سبب اقبال اُن سے بے حد متاثر تھے۔ ایک حادثہ کے بعد جب انہوں نے
لکھا تو اس انداز سے کہ جس میں خلوص و عقیدت کی جھلک ہر ہر سطر سے ظاہر
خدا آپ کو دیر تک زندہ رکھے، تاکہ ہندوستان کے مسلمان اس قلب

گرمی سے متاثر ہوں، جو خدا نے آپ کے سینے میں رکھا ہے۔" بلاشبہ اکبر، اقبال کی
نگاہ میں پیر تھے۔ اور وہی محبت اور عقیدت تھی جو ایک مرید کو پیر سے ہو سکتی ہے
وہ اس بات کے منتظر تھے کہ خدا کرے جلد وہ وقت آئے کہ مجھے آپ سے شرفِ
نیاز حاصل ہو اور میں اپنے دل کو چیر کر آپ کے سامنے رکھ دوں۔ لاہور ایک
بڑا شہر ہے لیکن میں اس ہجوم میں تنہا ہوں ایک فردِ واحد بھی ایسا نہیں جس سے دل
کھول کر اپنے جذبات کا اظہار کیا جا سکے۔"

البتہ اکبر خود اس قدر مایوس ہو چکے تھے کہ اب کسی لائحہ عمل پر غور کرنا اُن کے
لئے دشوار طلب تھا۔ سر سید سے وہ مایوس ہو گئے تھے اور شبلی کی تجویز "کہ ندوۃ العلماء
میں انگریزی تعلیم رائج کی جائے۔" کو کسی نے پسند نہیں کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ علی گڑھ
خالص مغربیت میں ڈوب گیا اور ندوۃ خالص مشرقیت میں۔ مقصد دونوں کا نیک
تھا، اور ایک ہی تھا۔ لیکن دونوں جگہ کی انتہا پسندی نے خود مسلمانوں کو ایک
دوسرے سے بدظن کر دیا تھا۔ اقبال نے مغربی تعلیم اور مشرقی تعلیم میں امتزاج ضروری
اور لازمی سمجھا۔ اسی لئے مختلف خطوط میں قدیم و جدید تعلیم کو ملا کر "جدید تشکیل حیات
اسلامیہ" کرنا چاہتے تھے۔

انہوں نے علماء و فقہاء سے اگر اختلاف بھی کیا اور ان کے طریقۂ کار کو ناپسند
کیا تو اکبر کا سا لب و لہجہ اختیار نہیں کیا کہ۔ "لیکن مولوی ہرگز نہیں ہے خانساماں ہے"
بلکہ جامع اور ٹھوس تجاویز کے ذریعہ علماء و فقہاء کو جدید علوم سے روشناس کرنے کی
طرف توجہ دلائی ہے۔ وہ جس طرح قدیم علوم کو اسلامی افکار و ادبیات کو
سمجھنے کے لئے ضروری سمجھتے تھے، اسی طرح جدید علوم کو بھی حیاتِ انسانی کے لئے

لازمی تصور کرتے تھے۔ انہیں اس امر کا ازحد افسوس تھا کہ مسلمانوں میں تحریک ذہنی عملاً مسدود ہو گئی اور یہ کہ مسلمانوں کی جہالت کا یہ عالم ہے کہ جو کچھ ایک بڑی حد تک خود ان کے تمدن سے برآمد ہوا ہے وہ اسے بالکل غیر اسلامی سمجھتے ہیں۔ یورپ میں جذبۂ انسانیت کی تحریک کا ماخذ اسلامی فکر تھا۔ لیکن مسلمانوں کو اس زمانہ میں اس کا قطعاً احساس نہیں اور وہ اس بات پر ازحد افسوس کرتے تھے۔ کہ مسلمانوں نے یورپ میں سائنس اور فلسفہ کے جدید ثمر سے فائدہ نہیں اُٹھایا۔ حالانکہ جدید منطق کا نظام خود مسلمانوں کے اُن فضلاء کے سبب سے ظاہر ہوا کہ جنکی اہمیت اس زمانہ میں آہستہ آہستہ فراموش ہوتی جا رہی ہے۔ اس لئے اقبال کے خیال میں ایسے عالموں کا تیار کرنا ضروری ہے جو قدیم علوم کا پوری طرح احاطہ رکھتے ہوئے جدید علوم کو صحیح طور پر حاصل کرنے میں مستعد معلوم ہوں۔ وہ علماء کو ایک طرف اسلامی تاریخ، آرٹ اور علمی تہذیب کے مختلف پہلوؤں پر حاوی کرنا چاہتے تھے، تاکہ علوم اسلامیہ میں قانونی لٹریچر یعنی فقہ کی پوری تشریح پر ریسرچ کی جا سکے، اور مسلم دینیات کا مطالعہ اور اجتہاد ضروری سمجھا تاکہ ملت کی زندگی کا زاویۂ نگاہ قانونی شرع کے دائرہ میں اپنی روحانی ضرورت کو بھی ہاتھ سے نہ چھوڑے اور جدید ضروریات سے بھی بے خبر نہ رہے۔

ان کا نقطۂ نظر بالکل واضح تھا کہ مسلم دینیات کا مروجہ نصاب قدیم طرز پر مبنی ہے اور یہ طریق کار جدید مسائل کے طلوع اور قدیم مسائل کی طرح ترقی کے مقابلہ میں کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ وہ اس طریق کار کو یکسر بدلنا چاہتے تھے تاکہ دینیات کو جدید مسائل اور علم کلام کی تعمیر و تشکیل کو نئے انداز میں پیش کیا جائے

اور اس کے لئے ندوۃ اور دیوبند کے بہترین مواد کو افکارِ جدیدہ اور سائنس کے لئے استعمال کیا جا سکے۔ اور خالص سائنٹیفک تحقیقات کا مخصوص ذوق رکھنے والے (طلباء) جدید ریاضیات، سائنس اور فلسفہ کی تعلیم حاصل کر سکیں۔ اور اسی طرح ان حضرات کو جو عربی اچھی طرح سے جانتے ہوں، مسلم تمدن اور تہذیب کی عام تعلیم دلانا چاہتے تھے۔ تیسرے یہ کہ وہ دیوبند اور لکھنؤ کے ذہین اور طباع لڑکوں کو قانونِ محمدی کی تعمیری تشکیل کی طرف متوجہ کرنا چاہتے تھے تاکہ ایک طرف وہ اپنے آپ کو قانونی ریسرچ کے لئے وقف کر دیں، دوسری طرف مسلمان قانون کی مجلس قانون ساز کے لئے بھی مفید ہو سکیں۔

"وہ اس بات کے حامی تھے کہ چونکہ دیوبند اور ندوہ کے افراد کی علمی قابلیت یونیورسٹی کے گریجویٹ حضرات سے بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اس لئے وہی لوگ جدید تعلیم کے اخذ کرنے کی قابلیت بھی رکھتے ہیں اور یہ کہ ایسے حضرات یونیورسٹی انٹرمیڈیٹ امتحان پاس کرنا لازمی قرار دیا جائے (اور یہ کہ ریاضیات، فلسفہ اور اقتصادیات میں سے کوئی بھی مضمون منتخب کریں)

وہ علی گڑھ یونیورسٹی کی تعلیم کو بنیادی طور سے خالص اسلامی رنگ میں رنگنا چاہتے تھے، اس طرح کہ یونیورسٹی تعلیم کے آخری حدود بی اے۔ ایم اے کے درجے سے انگریزی تعلیم بالکل حذف کر دی جائے۔ یہ کہ ان امتحانات کو صرف اور فلسفہ کی تعلیم کے لئے مخصوص کر دیا جائے۔

(اقبال صاحب کے وہ خطوط خصوصیت کے ساتھ اہمیت رکھتے ہیں جو انہوں

نے صاحبزادہ آفتاب احمد کو لکھے اور یہ تجویز پیش کی کہ اسلامی حکمت اور ادبیات
آرٹ، تاریخ نیز دینیات کا نصاب اختیار کرنے والوں کے لئے جرمن اور فرنچ
زبانوں کا سیکھنا ضروری قرار دیا جائے۔ اس طرح وہ قدیم و جدید تعلیم کو بیک وقت
ایک نئے انداز میں پیش کرنے کے خواہش مند تھے، لیکن چونکہ قدیم و جدید اصولِ تعلیم
کے مابین روحانی آزادی کے پرستاروں اور حکومت کے پرستاروں کے درمیان
دنیائے اسلام میں کشمکش شروع ہو گئی ہے اس لئے ان کے خیال میں اس مسئلہ کی
طرف قدم بڑھانے کے لئے محتاط رہنا ضروری ہے تاکہ فکر و حکمت کی اصلاح اس
طرح عمل میں لائی جائے تاکہ معاشرتی امن و سکون میں کوئی خلل نہ آنے پائے۔

اقبال مرحوم اس طرح قدیم علوم کے فاضل حضرات کو یونیورسٹی کے ماحول
میں لا کر ان کے ذہنی رجحانات کو نئے تقاضوں کی طرف منعطف کر دینا چاہتے
تھے۔ وہ انگریزی کی خواہ مخواہ اہمیت پسند نہیں کرتے تھے، البتہ سائنس اور فلسفہ
کی تعلیم نہایت ہی ضروری خیال کرتے تھے، یہی وہ صورتیں تھیں جن کو عملی جامہ پہنا
کر اقبال جدید تشکیل حیاتِ اسلامیہ کرنا چاہتے تھے۔

اگر ان کی یہ تجویز عملاً بروئے کار آجاتی تو ہمارے ہاں صحیح معنی میں ایسے
افراد پیدا ہو سکتے تھے جو ایک طرف قدیم علوم سے واقف حضرات کی ذہنی تربیت
زمانہ کے موجودہ تقاضوں کے مطابق کرتی اور ہم عربی علوم کے فوائد سے محروم
رہتے اور جدید علوم سے بے بہرہ۔

وہ اس طرح کی تحریکات کی ابتدا جہاں جہاں دیکھتے وہ ان لوگوں کی
ہمت افزائی کرتے۔ ۱۹۲۹ء میں مولانا عبدالماجد دریا آبادی صاحب کے نام ایک خط

میں مسلم یونیورسٹی میں سر راس مسعود کی کوششوں کو سراہا اور خط میں لکھا کہ وہ بھی
مذہبی مضامین پر طلباء سے گفتگو کریں اس لئے کہ ہندوستان میں مذہب کے خلاف
شدید طوفان اُٹھ رہا ہے اور نوجوانوں کے دلوں میں اسلام کے لئے بڑی تڑپ
موجود ہے۔

۱۹۳۱ء میں مولانا احسن راغب نے کلکتہ میں "جمعیۃ الشبان المسلمین" قائم
کی، تو اطلاع ملنے پر فوراً مبارک باد دی۔ کیونکہ اس کا مقصد فکرِ اسلامی کی
اشاعت تھی۔

۱۹۳۳ء میں شیر کشمیر شیخ عبداللہ کو مسلمانوں کی آزادی کی جد و جہد کے لئے
ان کی کوششوں پر ان کی تعریف بھی کی اور ہمت افزائی بھی، یہاں تحریکِ
اسلامیہ کا خیال ان کے دل میں موجزن رہا۔ اور شیخ صاحب موصوف کی مخلصانہ
کوششوں پر بے حد خوشی کا اظہار بھی کیا۔

یہی فکر اُن کو ہمیشہ دامنگیر رہی۔ چنانچہ اسی سال ڈاکٹر عبدالحق مرحوم کو انجمن
کا دفتر مستقل طور پر لاہور منتقل کرنے کے لئے تجویز پیش کی تاکہ مسلمانوں کو اپنے
علما کے لئے قرار واقعی طور پر آسانی میسر ہو سکے، اور ظاہر ہے کہ اردو ہی اس
سلسلہ میں سب سے اہم زبان تھی جو برصغیر پاک و ہند میں یہ کام بہتر طور سے انجام
دے سکتی تھی۔

اُن کا اسلوب اور لہجہ تصنع اور آرٹ سے پاک تھا جو کچھ مسلمانوں کی
بہتری کے لئے مناسب سمجھا اور جس کو اس خدمت کے لئے اہل سمجھا۔ انہوں
نے صاف صاف کہا۔ اور بغیر رعایت کے کہا۔ اسی لئے ان کے خطوط پر ایک مرتبہ

گہری نظر ڈالنے کی ضرورت ہے تاکہ معلوم ہو سکے کہ انہوں نے کن لوگوں سے تحریک اسلامی کے احیاء کے لئے کس کس انداز میں گفتگو کی، اور کس طرح انہوں نے زندگی کے مختلف شعبوں میں ممتاز افراد کو ایک وسیع اسلامی نقطۂ نظر کو پھیلانے کے لئے توجہ دلائی۔ اُن کے سامنے تعلیم و تعلم کے چند واضح اصول تھے، جن کو سامنے رکھ کر انہوں نے ایک طرف صاحبزادہ آفتاب احمد صاحب مرحوم وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام، دوسری سر راس مسعود مرحوم کے نام تیسری طرف خواجہ غلام السیدین کے نام۔ اور سب سے اہم اور سب سے بعد میں قائداعظم کے نام خطوط لکھے، جہاں زندگی و ادب کے بڑے مسائل پر اظہارِ خیال کیا گیا۔

انہوں نے شعر و شاعری کے سلسلہ میں جب کبھی کسی کو خط لکھا تو ملّی اور اخلاقی خصائص کو بھی مدنظر رکھنے کی طرف توجہ دلائی کہ شاعری کا مقصد آئندہ نسلوں کی زندگی بہتر بنانا ہونا چاہیئے۔

اقبال کی عظمت کا راز اسی میں پوشیدہ ہے کہ وہ ساری عمر سیکھنے، سمجھنے اور حاصل کرنے سے کبھی نہیں شرمائے۔ اور ایسے علماء سے برابر مشورے لینے پر فخر کرتے رہے اور وقت کے ساتھ ساتھ وہ اس امر کا بھی اظہار کرتے رہے۔

خالص علمی لحاظ سے وہ مولانا اسلم جیراج پوری اور مولانا سلیمان سے بے حد متاثر تھے۔ اور مولانا سلیمان ندوی مرحوم کی علمی قابلیت اور فقہی بصیرت کے ازحد قائل تھے، اُن کا خیال تھا کہ فقہ اسلامی کی مفصل تاریخ ہندوستان میں لکھے جانے کی ضرورت ہے اور وہ انہی کو اس کا اہل بھی سمجھتے تھے اور یہ کہ وہ اس سلسلہ

میں علمی مسائل کے اشکال کے حل میں حرفِ آخر ہیں۔ وہ انھیں ہمیشہ مخدومی کے لفظ سے مخاطب کرتے اور ان کی صحبت سے مستفید ہونے کے دعائیں مانگتے۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ خداوند عالم ان کو اطمینان فرمائے تاکہ وہ ملت اسلامی کی زیادہ سے زیادہ خدمت کر سکیں۔ جس دعوت میں وہ کابل یونیورسٹی کی تشکیل کے سلسلہ میں بلائے گئے تھے، خیال یہی ہے کہ مولانا سلیمان ندوی مرحوم کو اس وفد میں شریک کرنے کے محرک اقبال مرحوم ہی تھے۔

بہرحال بقول آل احمد سرور "ان کے خطوط سے جہاں قدیم و جدید نظریات کے متعلق ان کے نقطۂ نظر کا پتہ چلتا ہے، وہاں ان کی وسیع معلومات، حیرت انگیز علم کی پیاس اور بے نظیر حق کی تلاش بھی ظاہر ہوتی ہے۔ ان کے خطوط کی دلچسپی ان کی شوخی، رنگینی و ظرافت میں نہیں ہے۔ بلکہ ان کے خیالات کی اہمیت عظمت میں مضمر ہے۔"

نیاز فتحپوری

گذشتہ صفحات میں جن ناموراہلِ قلم کی خطوط نویسی پر تبصرہ کیا گیا ہے ان میں سے اب کوئی اس دنیا میں نہیں۔ [illegible] میں نیاز فتحپوری صاحب کا ذکر سب سے آخر میں اس لئے کیا گیا ہے کہ وہ بفضلہ بقید حیات ہیں۔ ان کے زورِ قلم کا اثر ابھی تک نگار کی شکل میں باقی ہے اور ان کی تحریر کا سکہ گویا سکۂ رائج الوقت ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ عرصے بعد ان کے خطوط کا مجموعہ اب جلد سوئم کے نام سے منظرِ عام پر آجائے اور [illegible] اردو خطوط نویسی کے نئے پہلو نظر کے سامنے آجائیں۔ اس لئے کہ اُن [illegible] کے دونوں مطبوعہ مجموعے تقریباً تیس سال پہلے کے ہیں۔

جبکہ ان کے قلم کی گردش اور جولانی میں جب سے اب تک کوئی کمی واقع نہیں ہوئی بلکہ وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے اداریے، مضامین اور دلچسپ تبصرے اپنی جگہ مستحکم دلائل کے ساتھ گویا اٹل پہاڑ ہیں اور ان میں کسی شکست و ریخت کا اثر نہیں۔

(ان کے دلچسپ تبصروں میں سے ایک روشن مثال "قادیانی مذہب" پر تبصرہ بھی ہے۔ جس نے لوگوں کے کان کھڑے کر دیئے۔ البتہ انہوں نے جس انداز میں قادیانیوں کی تنظیم۔ یک جہتی اور اشاعتِ اسلام کی منظم تحریک و سرگرمی پر روشنی ڈالی، اس کا جواب کسی سے بن نہیں پڑا۔ ایک ادیب کی گہری نگاہ، اپنے مخصوص اندازِ بیان میں جذباتی اندازِ بیان سے دور بعض حقیقتوں کو پیش کر دیتی ہے چاہے وہ تلخ ہی کیوں نہ ہوں)

یہی حال ان کے خطوط کا بھی ہے کہ ان کا ہر خط گویا انفرادی رنگ اور ماہرانہ اندازِ بیان کے ساتھ اس طرح مختصر اور جامع ہے کہ جہاں کتر بیونت کی گنجائش نہیں۔ ہر ہر فقرہ بتاتا ہے کہ یہ خطوط جواب ہیں، سوال نہیں اور جواب بھی قاطع، کہ جس کا زخم بھرا نہیں جا سکتا۔ غالب نے اگرچہ برہان قاطع کے جواب میں قاطع برہان لکھی۔ لیکن ان خطوط کا ہر فقرہ برہان قاطع بھی ہے اور قاطع برہان بھی۔ جس میں بیک وقت جلال بھی ہے اور جمال بھی۔

بیسویں صدی کے شروع ہی میں ہمارے ادب پر انگریزی ادب کا اثر براہِ راست پڑا اور مغربی ادب کے دورِ رومانیت نے ہمارے انشا پردازوں پر کافی اثر ڈالا۔ اور اردو میں خطوط نویسی اس سے اثر لئے بغیر نہ رہ سکی۔

اردو افسانہ نگاری میں تو باقاعدہ رومانیت پرستی کا آغاز سجاد حیدر یلدرم۔ [...]پوری سے ہوا۔ "صلائے عام" کے اجرا نے انشا پردازی میں رومانیت [...]کی اشاعت میں باقاعدہ حصہ لیا اور اس کے اڈیٹر نے اس قسم کے لطیف و [...]خطوط خود اپنے رسالے میں شائع کئے جن میں بیان کی خوش اسلوبی اور [...] پاکیزگی کا خیال باقاعدہ رکھا گیا۔

نیاز فتح پوری انگریزی ادب کے دورِ رومانیت سے از حد متاثر ہیں۔ [ا]ن کے افسانے اسی رنگ میں ہیں۔ لیکن ان کے خطوط، اُن کے افسانوں [سے ز]یادہ مقبول ہوئے۔ بلاشبہ ان کی نظر فارسی و اردو ادب پر گہری ہے اور [...] انداز تحریر کا وسیع تجربہ بھی انہیں حاصل ہے۔ انہوں نے مسلسل لکھا، [...]ادب کے ہر گوشہ پر لکھا۔ اسی لئے ان کے قلم میں پختگی آگئی۔ لیکن مکتوب [...]میں جو لطیف طنز کا رنگ انہوں نے مستقلاً اختیار کیا اُس نے اُن کے [...]خطوط کی بھی باتوں میں رنگا رنگی، دلچسپی اور تنوع اس طرح پیدا کر دیا ہے [...] خط چاہے کتنا ہی مختصر کیوں نہ ہو، دلچسپی اور لطف سے خالی نہیں۔

وہ ایک کامیاب اور نامور ترین انشاء پرداز ہیں۔ دورِ حاضرہ میں ان [...] صلاحیتیں بھی تخلیقی رنگ لئے ہوئے ہیں۔ اس لئے ان کے خطوط [...] ان کا انفرادی رنگ ہے جس میں انہوں نے اپنے ذوق اور ذہانت کا [...]ے کر خطوط کو نہ صرف مکتوب الیہ کے لئے بلکہ دوسروں کے لئے بھی [...] مفید اور دلچسپ بنا دیا ہے۔

[ان] کے خطوط ان کی ذاتی پسندیدگی و ناپسندیدگی کا اظہار ہیں۔ لیکن وہ

جو کچھ لکھتے ہیں اُس میں اُن کے اپنے تاثرات، ایک فیصلہ کن طریقے سے فطری
طور پہ نمایاں ہو جاتے ہیں۔ اس طرح ایک طرف ان کی شخصیت، انفرادیت
کا رجحان طبع، ان کے اندازِ فکر اور رومان پرستی کا پتہ چلتا ہے۔ دوسری طرف
جو کچھ لکھتے ہیں، اس انداز سے لکھتے ہیں کہ دلائل مختصر ہونے کے باوجود ہمارے
نفسیاتی پس منظر کو لئے ہوئے ہوتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے ہمارے
سامنے ایسا آئینہ عکس ریز رکھ دیا ہے جس میں ہم اپنی چھپی ہوئی کمزوریوں کو
خود دیکھ کر اقرار کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اور اس طرح مکتوب نگار وسیع نقطۂ
کے ساتھ مکتوب الیہ کو اپنا ہم خیال کر لیتا ہے کہ جس کے بغیر کوئی اور چارہ کار
نہیں رہتا۔ مختصر جملے میں اپنے پورے دلائل کے ساتھ خط کا وزن قائم
ہیں۔ نہ خط مضمون بنتا ہے اور نہ محض خانہ پُری ہوتا ہے۔ ان میں اکتا دینے
طوالت نہیں۔ وہ نجی ہونے کے باوجود وسعت نظر لئے ہوئے ہوتے ہیں۔
ان خطوط میں ادبی گلکاریاں ہر با ذوق کے لئے دلچسپی کا باعث ہیں۔
ان کے خطوط میں اکثر و بیشتر افراد، بعض گمنام شخصیتوں اور کبھی کبھی
لوگوں کے متعلق ادبی چھینٹے اپنی ایسی حقیقت لئے ہوئے ہیں جن کی صداقت
انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اور وہ ہر زمانے میں اس قسم کے افراد پر اسی طرح صادق
ہیں جس طرح اُس مخصوص ذات پر جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔
وہ سپاٹ نہیں بلکہ خطوط میں شگفتگی، لطفِ بیان کو سادگی کے ساتھ
کو وابستہ کر دیا گیا ہے۔ اکثر و بیشتر جگہ فارسی کے برمحل اشعار ایسے استعمال
ہیں جس سے خود مکتوب نگار کی برجستگی تحریر نمایاں ہو کر ان کے خطوط میں

ڈال دیتی ہے۔ اور اتنی بے تکلفی اور بے ساختہ پن ہے کہ تمام خطوط میں آورد کا
کہیں نام نہیں۔ بلکہ آمد ہی آمد ہے۔ ان میں بعض دوستوں کے نام ہیں، بعض
بزرگوں کے نام، بعض خوردوں کے نام۔ لیکن ہر خط میں لطافتِ بیان کو کہیں
ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور بعض بے تکلف دوستوں کے نام جو خطوط ہیں اُن
میں بذلہ سنجی بڑھتے بڑھتے تنقیدِ حیات ہو گئی ہے۔ وہ معمولی معمولی باتوں سے
خطوط میں بے حد لطف پیدا کر دیتے ہیں۔ مثلاً "جناب کو شاید علم نہیں کہ میں
داڑھی منڈا کر اب صورتاً بھی مسخ ہو گیا ہوں۔ خدانخواستہ اگر آپ کی نگاہ کو
کوئی گزند پہنچ گیا تو میں کیا کروں؟"
ایک اور بات قابلِ توجہ یہ ہے کہ ان میں جوابات کی جو توانائی ہے اُس نے
خطوط کو اور بھی دلچسپ بنا دیا ہے۔ ان کا پورا خط پڑھنے کے بعد نہ صرف
مکتوب نگار کے دلی تاثرات کا اندازہ ہوتا ہے۔ بلکہ خود مکتوب الیہ کی شخصیت
بے نقاب کر دیتے ہیں۔ یہ تو بہت ہی اچھا ہوا کہ انہوں نے مکتوب الیہ کے
نام ارشاد فرمایئے۔ جس سے اُس بے چارے کی لاج رکھ لی ورنہ —
بظاہر وہ طبعاً قدامت پسند ہیں۔ جیسا کہ انہوں نے ایک خط میں اعتراف
(صفحہ ۱۴) لیکن خطوط نویسی/ خطوط نگاری میں جو جدت پسندی کا
ہے۔ وہ اپنی جگہ پر اٹل ہے۔ مثلاً ایک دوست کو انہوں نے خط میں
میں جس غم کا شکار ہو کر سرد مہر ہو چکا ہوں اس کے آپ ابھی صرف
اس فقرے میں "صرف" کی داد نہیں دی جا سکتی۔
خطوط سے ظاہر ہے کہ وہ خوب جانتے ہیں کہ زمانے کے آئین دلیری

کے ساتھ، اندازِ جانگدازی و جان سپاری بھی بدل گیا۔ اس لئے اِس زمانہ میں
غمِ عشق گوارا کیا جاسکتا ہے۔ بشرطیکہ غمِ روزگار سے فرصت ہو۔ وہ خود اپنے
آپ کو انیسویں صدی کی چیز بتاتے ہیں (بحوالہ صفحہ ۱۸) غالباً اسی لئے ان کے
سوچنے سمجھنے کا انداز بیسویں صدی کی پیداوار سے مختلف ہے۔ ایک خاص بات
ان خطوط سے یہ ظاہر ہوتی ہے کہ وہ جذباتی نہیں۔ عقلیت پسند ہیں۔
اس قدر صاف گو اور زود گو ہیں کہ جب کہنے پر آتے ہیں تو پھر کسی کا لحاظ نہیں
کرتے۔ مکتوب الیہ کی غلطیوں، کمزوریوں کو اس طرح نمایاں کرتے ہیں کہ مجال دم
زدن نہیں رہتی۔ ان کی ترشیاں بہت سوں کا نشہ اتارنے کے لئے کافی حوصلہ
رکھتی ہیں۔ ایک خط میں انہوں نے لکھا ہے کہ "میں فی الحال سفر سے معذور ہوں
ورنہ آپ کا نشہ دور کرنے کے لئے بہت سی ترشیاں اور بھی اپنے پاس رکھتا
ہوں۔

جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے۔ نیاز کی طنز نگاری ان کے خطوط کی جان ہے اس
کے ساتھ ساتھ ان کی گرفت مضبوط۔ تحریر پختہ۔ طرزِ بیان بے حد اچھوتا ہے
ان کے خطوط کا ہر ہر فقرہ توجہ سے پڑھنے کے لائق ہے۔ ان کے ہاں
ادبی سے خطاب طنز ہی طنز ہے۔ وہ نہایت بے باک ہیں اور جب لکھنے
تو پھر پروا نہیں کرتے اور بظاہر ہمدرد بننے والوں کا پردہ چاک کرکے رکھ
دیتے ہیں۔

اس کے علاوہ ان کے خطوط میں جن ادبی نکات، تنقیدی اصولوں اور
روشوں کی طرف نمایاں اشارے ہیں۔ ان سے خود ان کے ذہن رسا اور

انداز فکر اپنا سکے ہم سے منوا لیتا ہے۔ مومن سے دلچسپی۔ میر درد کے مسائل تصوف
سے آگاہی۔ غالب کے فارسی شاعری کا تفصیلی مطالعہ۔ فارسی شاعری کے اردو
شاعری پر اثرات۔ عرفی کے شاعرانہ تخیل اور کمالات کا اعتراف۔ جلال، امیر اور
دوسرے شاعروں کے اشعار کے حوالے اس بات کی دلیل ہیں کہ فارسی شعراء کی معنی
آفرینی نے ان کے اردو خطوط نویسی پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ غزل میں وہ سعدی کو
پسند کرتے ہیں۔ اسی لئے خطوط انتہائی مختصر ہوتے ہیں لیکن بلاغت کی جان۔
کہیں کہیں وہ لکھنؤ کی زبان میں حضرت کو حضت کہتے ہیں۔ جس سے مقصود
لکھنؤ کی مصنوعی تہذیب کا مذاق اڑانا ہے یا مکتوب الیہ کی زبان میں گفتگو
۔ ان کے خطوط میں غمِ دوران اور غمِ عشق میں جو امتیاز ہے وہ لطیف
اور حقیقت پر مبنی بھی۔ یوں تو غمِ عشق کس پر حملہ آور نہیں ہوتا لیکن
عشق کھا کر مغالطے کھاتے ہیں یا مغالطوں میں پڑ جاتے ہیں۔ یہ خطوط ان
لطوں کو خوب واضح کرتے ہیں۔ ایسے مغالطے کس کی زندگی میں نہیں آتے
ان مغالطوں میں مبتلا نہیں ہوتا۔ لیکن عقل آتی ہے بے عقلی کے بعد۔
بات سمجھ میں آتی ہے۔ وقت گزرنے کے بعد۔ اسی طرح غمِ دوران بھی غمِ
کم حملہ آور نہیں۔ اور اگر بدقسمتی سے یا خوش قسمتی سے (اس کی اپنی)
دونوں سے واسطہ پڑ جائے تو اس منجدھار میں ثابت قدم رہنا
کا کام ہے۔ بسا اوقات جان بھی ہاتھ سے جاتی ہے اور جانِ جہاں
صورت میں دوست اگر صحیح راستہ نہ دکھائے تو پھر اس کی رفاقت
نہیں۔ نیاز فتح پوری نے زمانے کے سرد و گرم کو چکھا بھی۔ اہلِ

لیکن ان خطوط سے یہیں معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح اپنی دور رس عقل سے
ان تاثرات کا اظہار کیا جا سکتا ہے۔ ان کے نظریے نہ مذہبی نظریے ہیں۔
نہ سیاسی نظریے، بلکہ سماجی نظریے ہیں۔ جن کی بنیاد صرف اخلاق پر یا کم از کم
سچائی پر مبنی ہیں۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں پوری طرح ناپ تول کر۔ باون تولے
پاؤ رتی کی بات۔ اُن کا ظاہر و باطن ایک ہے۔ اس میں منافقت نہیں۔

"میں آپ کی تصنیف کی کیا داد دوں۔ اور اس پر کیا لکھوں۔ کتاب کے
اچھے ہونے میں شبہ نہیں۔ آپ کی زبان، آپ کی تلاش، آپ کی نیت
سب اپنی اپنی جگہ ستائش کے قابل ہیں۔ لیکن افادی حیثیت سے
میں اسے بیکار سمجھتا ہوں۔ اگر اس قسم کی رائے آپ چاہتے ہیں تو یہ
حاضر ہے۔"

صفحہ ۲۶۱۔ جلد دوم۔

وہ نہ رک رک کر باتیں کرنے کے عادی ہیں۔ نہ رک رک کر لکھنے کے۔
جو سوچتے ہیں وہ لکھتے ہیں۔ اور جو لکھتے ہیں وہ ایسا بھرپور وار ہوتا ہے کہ
سہنے کے لئے لوہے کا جگر اور فولاد کا دل چاہیئے۔ طنز کی چاشنی۔ لطفِ
بیان کو بڑھا دیتی ہے۔ لیکن ان کا کوئی خط لطفِ زبان کے لئے نہیں۔
بلکہ حقیقتوں کے اظہار کے لئے۔ یہ اور بات ہے کہ تلخ جواب کو لطف
زبان کے ساتھ ایسا گوارا بنا دیا جاتا ہے کہ جواب (نشتر) کی کسک تو معلوم
ہوتی رہے لیکن بات لطافت بیان سے گرنے نہیں پائی۔ ان کے خطوط،
اُن کے ادبی نقطۂ نظر کے معلوم کرنے کا بہترین ذریعہ ہیں۔ ان کے ذریعے
ہمیں یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ زبان کے سلسلہ میں دبستانِ لکھنؤ و دہلی کی خصوصیات

کیا ہیں۔ اور اگر واقعی کسی دبستان میں بعض کمزوریاں تھیں تو آخر ان کے
اظہار میں باک ہی کیا ہے۔ لیکن اس قسم کے نزاع کو پسند بھی کیا۔

"اس میں شک نہیں کہ صحیح رنگ تغزل کی مثالیں ہم کو دہلی اسکول
میں زیادہ ملتی ہیں۔ لیکن تراش و خراش کا سہرا یقیناً لکھنؤ کے سر ہے۔ آپ
کیوں اس بحث میں پڑ کے وقت ضائع کریں گے، کوئی اور کام کی بات
کیجئے۔"

ہم بہت کچھ سوچتے ہیں لیکن اس کو ایک اچھے انداز میں بیان کرنے میں
دقتیں اور الجھنیں محسوس کرتے ہیں۔ یا پیدا کر دیتے ہیں۔ لیکن نیاز کے سامنے
سوچنے، سمجھنے اور اس پر رائے زنی کرنے کے جو راستے اور ذریعے تھے، ان
میں کبھی الجھن پیدا نہیں ہوئی۔ اس لئے کہ انہوں نے کبھی دوسروں کی عینک
سے دنیا کو دیکھنے کی کوشش ہی نہیں اور کبھی خوش آئند امیدوں پر جینے کو
اچھا نہیں سمجھا۔

مکتوبات میں جگہ جگہ علمی بحثیں، فارسی شعراء کے کلام سے مناسب حوالے۔
کبھی کبھی شعر ہی سے خط کا آغاز، اردو فارسی شعراء کے کلام پر تبصرے۔ مؤمن۔
غالب۔ بیدل کے کلام پر اظہارِ خیال ملتا ہے۔ علمی مباحث کے سلسلہ میں فارسی
شعراء کے کلام سے مثالیں ان پر دعوی کی دلیل میں اس طرح لاتے ہیں کہ گویا یہ
سامنے کی چیزیں ہیں اور پھر شعراء کے مختلف نقطۂ نظر ان کے کلام سے ڈھونڈھ
کر اس طرح پیش کئے گئے ہیں کہ جن سے ان کے گہرے مطالعہ کا نقش دل پر بیٹھ
جاتا ہے۔ وہ بیدل کے شیدا ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ "تصوف برائے شعر گفتن

خوب است" کی حد تک وہ بیگانۂ لذت تصوف ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ "محبت میں قیود کے پابند نہیں بلکہ صرف تڑپنے کو اصل مقصد سمجھتے ہیں۔"

وہ شدید احساس کے مالک ہیں، نظریات میں متشدد بھی ہیں۔ لیکن تعصب کی جھلک اُن میں نہیں جھلکتی۔ وہ اپنے نظریات خواہ مخواہ کسی پر ٹھونستے نہیں۔ نہ اُن سے اختلاف رکھنے والوں پر حقارت کی نظر ڈالتے ہیں۔ البتہ مولویوں سے ناراضی قیامت کی حد تک ہے۔ ان کے خیال میں سانپ کی قسمیں گنی جا سکتی ہیں لیکن مولویوں کی نہیں۔

مومن کی طنز نگاری نے انھیں اس قدر متاثر کیا کہ ان کا کوئی خط مومن کی طنزیہ نگاری سے کم نہیں۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ کسی بگڑے دل کو راہِ راست پر لانے کے لئے سوائے اس کے اور کوئی حربہ کار آمد ہوتا بھی نہیں۔

خطوط شروع کرنے اور ختم کرنے کا انداز مومن و غالب کی طرح ہے جیسے اچانک کوئی دوست آجائے اور اُس سے بلا رسمی پرسش حال کے مخاطب ہو جائیں اور پھر سلسلۂ کلام اس طرح ختم ہے کہ بس وہ سن کر چلے گئے ہوں۔

یہ تو بہت ہی اچھا ہوا کہ نیاز صاحب نے مخاطب (مکتوب الیہ) کے نام خطوط میں نہیں دیئے۔ ورنہ معلوم نہیں کس کس بیچارے کی پردہ دری ہوتی۔ ان کے قلم کی جولانیوں نے جو بہت حد تک بجی گفتگو کہلائی جا سکتی ہے، شخصیتوں کے چہروں پر سے فریب کے نقاب آتارنے یا اُنھیں تار تار کرنے میں جس چابکدستی سے کام لیا ہے اس سے کہیں کسی کے متعلق حقارت کا اظہار نہیں ہوتا۔ بلکہ ہمدردی اور خلوص کا اظہار ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ناصح کی بات کبھی کسی کو اچھی لگتی ہی

نہیں۔ اور وہ کہے بغیر باز آتے نہیں۔

ادبی معیاروں پر گفتگو کے علاوہ ان کے خطوط میں ہندوستان کے کلا[...] پر جن تاثرات کا اظہار ہے اس میں ان کی صاف گوئی سے مسائل کا اور صحیح رخ نظر کے سامنے آجاتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی صاف گوئی ایک عالم سے جھگڑا مول لے لیا ہے۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ ان کے سوچنے کا [...] صرف عقلی ہے، جذباتی نہیں۔

اس دور میں سوانح عمریوں کی اشاعت نے خطوط کی اہمیت [...] بھی اضافہ کر دیا ہے۔ کبھی کبھی زندگی میں اور اکثر و بیشتر مرنے کے بعد سوانح [...] دلچسپی رکھنے والے، افراد کی زندگیوں کا نفسیاتی و سیاسی مطالعہ کرنے [...] کے خطوط کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ اور گویا مکتوب الیہ مکتوب نگار سے بلاواسطہ قریب پاتا ہے، یہ قربت ہی خطوط کو زیادہ [...] دیتی ہے۔

غالباً اسی لئے شخصیتوں کی سوانح عمریوں کے ساتھ ساتھ کئی شخصی[...] خطوط بھی شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں ڈاکٹر عبدالحق صاحب اور مولانا سی[...] ندوی صاحب مرحوم کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے ضخیم خطو[...] اشاعت خود ایک مفصل تبصرہ کی محتاج ہے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے [...] سادگی اور حقیقت نگاری کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ بقول ڈاکٹر [...] یہ سائنٹفک دور کی خصوصیت کہی جا سکتی ہے جس میں حقائق کو بجنسہٖ پیش کر[...] ویسے بھی ڈاکٹر صاحب ایک دور کی تاریخ ہیں۔ اور ان کے خطوط، ان کے

سے کسی طرح کم نہیں کہلائے جا سکتے۔

علامہ سلیمان ندوی مرحوم کو اغلباً علمی سرگرمیوں نے اس فن کی طرف پوری طرح متوجہ ہونے نہیں دیا۔ وہ ساری عمر علمی تصانیف اور اسلام کی خدمت میں مصروف رہے۔ اور جہاں استاد انھیں بٹھا گئے تھے اور جس مقصد کے لئے بٹھا گئے تھے بس وہیں بیٹھے رہے، اور وہی کام کرتے رہے۔ اگر حالات کی ناہمواری ان کا ساتھ نہ چھوڑتی تو وہ مر کر ہی وہاں سے اٹھتے۔ انہوں نے (عربی کا فاضل ترین انسان ہوتے ہوئے بھی) اردو کی ترقی و ترویج کے لئے جو اصول مرتب کئے اس نے اردو کی وسعت میں بے شمار راہیں کھول دیں۔

نیاز کے بعد اگر اس فن پر کوئی قلم ہاتھ میں اُس آن بان کے ساتھ لے سکتا ہے تو وہ صرف جوشؔ ہیں لیکن جوشؔ نے مکتوب نویسی کی طرف باقاعدہ توجہ نہیں کی۔ افکار کے جوشؔ نمبر میں اُن کے صرف چند خطوط شائع ہوئے ہیں۔ جن کے مخاطب صرف گنتی کے چند لوگ ہیں۔ ہو سکتا ہے آگے چل کر یہ ذخیرہ کی شکل میں ہماری نظر کے سامنے آجائے۔ ویسے بھی ہمیں جوشؔ کی علمی خدمات اور گہری نظر سے بڑی توقعات ہیں، اس لیے ان کے قلم سے نکلا ہوا ہر ہر لفظ اور ہر ہر حرف اپنی جگہ حرفِ آخر کی طرح مسلّم ہے۔ مخالفتوں کی آندھیاں، جوشؔ کی عالمانہ و مفکرانہ اندازِ تحریر اور زورِ استدلال و بیان کو کسی طرح کم نہیں کر سکتی ہیں۔ ویسے بھی مسلمان نے زندگی میں کبھی قدر نہیں کی اور مرنے کے بعد گن گوگاتا رہا۔

غالبؔ

"اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ ہندوستان کو مغلیہ سلطنت نے کیا دیا، تو میں بے تکلف یہ تین نام لوں گا۔ غالبؔ، اردو، تاج محل۔"

رشید احمد صدیقی

غالبؔ دورِ مغلیہ میں اس بزم کے صدر نشین ہیں جس کی بساط جلد اُلٹ جانے کے قریب تھی۔ اس دور کی حالت اس مریض کی سی تھی جس نے مرنے سے قبل کچھ تھوڑا سا سنبھالا لیا ہو۔ یہ بساط کس طرح الٹ دی گئی اور ہماری ذہنی معاشرتی معاشی، ادبی زندگی میں کیا انقلاب آیا۔ اور کس طرح خاندانِ مغلیہ کی آخری شمع بجھی کر برصغیر ہند و پاک کے پورے ماحول میں ایک ایسا انقلاب پیدا کر گئی جس کے اثرات و نتائج میں ہم آج سانس لے رہے ہیں۔

غالبؔ جیسے حساس دل اور جاندار شخصیت نے اسی ماحول میں آنکھ کھولی اور انفرادیت کو قائم رکھا۔ اگرچہ اس کے لئے بہت سی مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ میرؔ کے بخلاف ان مشکلات کو خوب سہتے رہے اور مذاق اُڑاتے رہے اسی لئے بقول سرورؔ، غالبؔ کے یہاں درد و غم بھی ہے مگر اسی درد و غم سے بلند ہونے اور اس پر کبھی کبھار ہنس لینے کا جذبہ بھی۔

غالبؔ کی زندگی میں ہمیں ایک باحوصلہ انسان کی پُرسکون اور جاذب شخصیت کا پرتو نظر آتا ہے جو پیہم مایوسیوں، جاگیردارانہ نظام کی سازشوں کے باوجود زندگی کے نشیب و فراز میں سے گزرتا ہی چلا جاتا ہے۔ وہ انسان جو محض اُمید کے

سہارے جیا لیکن ناکامیوں اور مسلسل شکست سہنے کے لئے سپاہیانہ بانکپن نہیں
چھوڑا۔ قرضداری، بے اولادی، سسرالی جھگڑے ان کے لئے فن و ادب کی قدر و قیمت
کم نہ کر سکے۔ بلکہ دن بدن اس سے وابستگی بڑھتی گئی۔

بچپن کے امیرانہ ماحول نے جو رنگ ان پر چڑھا دیا تھا ماحول کے پیش نظر
زندگی کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھنے کے عادی تھے۔ لیکن جس قدر ناکامیوں سے دوچار
ہوتے گئے اسی قدر شدت احساس ہوتا گیا اور اس کے نتائج شعر کا لباس پہن
کر صفحۂ کاغذ پر ظاہر ہوتے گئے۔

اسی امیرانہ ماحول کے سبب اُن کی زندگی کے ابتدائی چند سال جس قدر
آزادگی و بے راہ روی سے گذارے، اسی کی یاد انہیں ستاتی رہی اور بقیہ عمر
اُسی تصورِ جاناں کے لئے فرصت تلاش کرتے رہے۔ اُسی کی تلاش میں لکھنؤ،
بنارس، کلکتہ، رام پور، غرض نہ معلوم کہاں کہاں پھرتے رہے۔ اسی احساس حسن پرستی
نے ان کی زندگی میں خاصا سوز و گداز پیدا کر دیا تھا۔ اگرچہ بسا اوقات دل کی کمزوریوں
کا احساس مٹانے کے لئے مئے گلفام کی کثرت ضروری سمجھتے رہے۔ وہ غیر شعوری
طور پر زندگی سے بھاگتے پھرے۔ لیکن آخر یہ کہنا ہی پڑا کہ قیدِ حیات و بندِ غم سے
نجات موت سے پہلے ناممکن ہے۔

غالب کو قدیم عاشقانہ غزل گوئی کا دم بھرنے والا، وزن و قافیہ کی پابندیوں میں
جکڑا ہوا جو چاہے کہہ لیجئے۔ لیکن ایک ادیب یہ تمنا ضرور اپنے دل میں رکھتا ہے
کہ کاش میں ان کی زندگی میں اُن سے مل سکتا۔

غالب کی زندگی چاہے پرانا دیا کیوں نہ ہو لیکن اس سے ہی ادب و علم کی

بزم میں روشنی پھیلی۔ بیسویں صدی کی شاعری کے بیشتر حالیؔ کو غالب کی شاگردی
پر فخر رہا۔

غالباً غالب اس سلسلہ میں منفرد ہیں جن کی نہ صرف نظم بلکہ نثر نے ہماری
خطوط نویسی میں ہمارے ادب کا نیا رُخ پیدا کر دیا۔ جس کے بعد اردو میں انشاء
پردازی کا یہ فن مستقل حیثیت اختیار کر گیا۔

ان کی زندگی کے مختلف پہلو ہر طریق سے معرض بحث میں آچکے ہیں اور اکثر و
بیشتر گوشے منظرِ عام پر ہیں۔ ذیل کے مقالہ میں ان کی زندگی کے حالات کو تاریخ کی
لڑی میں پرو دیا گیا ہے تاکہ زندگی کے مدوجزر کا مشاہدہ تاریخ کے آئینہ میں کیا جا سکے۔

منظر حسنین زیدی ایم - اے
گورنمنٹ کالج سکھر

سوانح غالب تاریخی اعتبار سے

۲۸ر رجب سنہ ۱۲۱۲ھ — ۲۷ر دسمبر ۱۷۹۷ء چہارشنبہ بوقت شب مرزا غالب کالا محل پیپل منڈی آگرہ میں پیدا ہوئے۔

اسد اللہ نام عرف مرزا نوشہ تجویز ہوا (والدہ کا نام عزت النساء بیگم دختر خواجہ میرزا غلام حسین کمیدان)

سنہ ۱۸۰۳ء — مرزا کے والد عبد اللہ بیگ کی وفات راج گڑھ کے مقام پر ہوئی جب وہ الور کے راجہ کی ملازمت میں منسلک تھے مرزا کی عمر ۵ سال کی تھی۔ مرزا کے والد نے وفات کے وقت تین لڑکے اور تین بہنیں چھوڑیں ؎

کانی بود مشاہدہ، شاہد ضرور نیست
درخاک راج گڑھ پدرم رابود مزار

(غالب قصیدہ مہاراجۂ الور)

۱؎ صفحہ ۲۱ غالب نمبر علی گڑھ میگزین ۲؎ غالب مہر ص۵

سنہ ۱۸۰۶ء ۴ر مارچ تا ۴ر مئی — اسی سال مرزا کے چچا نصر اللہ بیگ سابق صوبیدار اکبرآباد جرنیل لیک کی اطاعت کے صلہ میں چار سو سوار کے بریگیڈیر بنائے گئے (ایک ہزار ذات تنخواہ مقرر ہوئی اور لاکھ ڈیڑھ لاکھ کی تاحین حیات جاگیر عطا ہوئی) انہوں نے ہی غالب کو پالا۔ نصر اللہ کا انتقال بمرگِ ناگاہ ہوا۔ نصر اللہ کے پسماندگان میں تین بہنیں، ایک بھتیجی اور دو بھتیجے تھے۔

(اردوئے معلی ص۲۵ مطبوعہ ۱۹۲۷ء)
(بزبانی غالب ص۲۴۲ غالب نمبر علیگڑھ میگزین)
(غالب بزبانی غالب ص۱۸ غلام رسول مہر)

بعض کہتے ہیں کہ ایک معرکہ میں باغیوں سے لڑتے ہوئے ہاتھی سے گر کر جان بحق ہوئے۔

(رسالہ اردو ۱۹۲۸ء ذکر غالب ص۲۱ مالک رام)

نصر اللہ کے انتقال کے بعد جاگیر ضبط ہوئی اور نواب احمد بخش کو پچیس ہزار معاف ہوئے اس شرط پر کہ پندرہ ہزار دستہ کی نگہداشت کے لئے اور دس ہزار متعلقین نصر اللہ کے لئے خرچ کریں گے۔ (ذکر غالب ص۲۳)

۶ر جون — نہ معلوم کس طرح نواب احمد بخش نے حکومت سے ایک شقہ حاصل کر لیا جس میں یہ درج تھا کہ "نواب مذکور مرزا

نصر اللہ بیگ کے متعلقین کو پانچ ہزار اس تفصیل سے دیں۔

خواجہ حاجی	نصر اللہ کی والدہ و تین بہنیں۔	مرزا نوشہ و یوسف
۲ ہزار سالانہ	ڈیڑھ ہزار سالانہ	ڈیڑھ ہزار سالانہ

(خواجہ حاجی ان پچاس سواروں کے افسر تھے جو نصر اللہ بیگ مرحوم کے چار سو کا بقیہ تھے اور نواب احمد بخش کی تحویل میں دیئے گئے تھے۔)

۱۸۰۲ء تا ۱۸۰۹ء

مرزا کی پرورش ننھال (خواجہ غلام حسین کمیدان کی محل سرا) میں ہوتی رہی اور مولوی معظم و نظیر اکبر آبادی سے (دس سے بارہ سال کی عمر) تعلیم حاصل کرتے رہے (ذکر غالب ص۲۵ بحوالہ یادگار غالب ص۱۳، ۲۷) اور ابتدائی تعلیم فارسی انہیں دونوں سے حاصل کی۔ عربی انہوں نے شرح ماۃ عامل تک پڑھی اور آخر تک غلطیاں کرتے رہے۔

(ذکر غالب ص۲۷ بحوالہ رسالہ ہندوستانی۔ جنوری ص۳۴)

اسی زمانے میں شعر گوئی کا شوق پیدا ہو گیا اور پتنگ بازی کے متعلق ایک مثنوی اردو میں لکھی۔

(کلیات نثر فارسی بحوالہ غالب نمبر ص۴۵)

؎ ایک دن مثلِ پتنگ کاغذی
لے کے دل سر رشتۂ آزادگی

خود بخود کچھ ہم سے کنیانے لگا
اس قدر بگڑا کہ سر کھانے لگا
میں کہا اے دل ہوائے دلبران
بسکہ تیرے حق میں رکھتی ہے زبان
پیچ میں ان کے نہ آنا زینہار
یہ نہیں ہوں گے کسو کے یار غار
گورے پنڈے پہ نہ ان کے کر نظر
کھینچ لیتے ہیں یہ ڈورے ڈال کر
اب تو مل جائیگی تیری ان سے سانٹھ
لیکن آخر کو پڑے گی ایسی گانٹھ
سخت مشکل ہو گا سلجھانا ترا
قہر ہے دل ان سے الجھانا ترا
یہ جو محفل میں بڑھاتے ہیں تجھے
بھول مت اس پر اڑاتے ہیں تجھے
ایک دن تجھ کو لڑا دیں گے کہیں
مفت میں ناحق کٹا دیں گے کہیں
دل نے سن کر کانپ کر کھا پیچ و تاب
غوطے میں جا کر دیا کٹ کر جواب
رشتہ در گردنم افگندہ دوست
می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

"بارہ برس کی عمر سے کاغذ نظم و نثر میں مانند اپنے نامۂ اعمال کے سیاہ کر رہا ہوں۔ باسٹھ سال ہوئے۔ پچاس برس اس شیوہ میں گذارے۔"

(بحوالہ امتیاز علی عرشی (غالب کی شعر گوئی، غالب نمبر، بزبانی غالب)

اسی زمانے میں انہوں نے فارسی میں کچھ اشعار بطور غزل موزوں کئے جن کی ردیف میں "یعنی چہ کے بجائے" "کہ چہ" استعمال کیا۔ شیخ معظم نے اعتراض کیا۔ چند دنوں کے بعد کلام ظہوری سے سند دکھائی۔ شیخ نے کہا "تمہیں فارسی زبان سے خداداد مناسبت ہے، ضرور فکر شعر کیا کرو۔"

(یادگار غالب ص۹۷)

سنہ ۱۸۱۰ء — اسی سال ہرمز کی آمد ہوئی۔

(حالی۔ ابوالکلام آزاد، مالک رام اس کی آمد کے قائل ہیں۔ لیکن امتیاز علی عرشی اور قاضی عبدالودود بیرسٹر کا خیال یہ ہے کہ یہ ایک فرضی نام ہے جو غالب نے اپنے مخالفین کا منہ بند کرنے کے لئے وضع کیا تھا۔ ص۴۷ غالب نمبر)

سنہ ۱۸۱۰ء ۸ اگست — مرزا دام سخت میں گرفتار ہوتے۔ جب امراؤ بیگم دختر مرزا الٰہی بخش معروف گیارہ برس کی ہوئیں تو اس زمانے کے دستور کے موافق ان کا بیاہ غالب سے کر دیا گیا۔ مرزا اس زمانے میں سفید فام، خوش شکل اور خوش گفتار تھے۔ غالب نمبر ص۷۹۔

(پروفیسر حمید احمد خان) (میر تقی میر کی وفات ۲۰ ستمبر کو واقع ہوئی)

سنہ ۱۸۱۱ء — مرزا حسام الدین حیدر (مرزا کے خسر الٰہی بخش کے دوست) کے اردو دیوان پر فارسی دیباچہ لکھا (ص۵۵ آثار غالب اکرام)

سنہ ۱۸۱۳ء — مرزا آگرہ چھوڑ کر دہلی چلے گئے۔ یہ غزل اسی زمانے کی ہے۔

"پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے
اسد خوشی سے میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے"

ڈاکٹر خورشید الاسلام ۱۸۱۲ء کی غزل بتاتے ہیں۔ بحوالہ غالب ص۲۷

(حوالہ امتیاز علی عرشی غالب نمبر ۱۰۶، اردوئے معلی ص۳۰۶)

بقول آل احمد سرور "غالب کے اس زمانے کے اشعار کوہ کندن کاہ برآوردن ہیں۔ لیکن ان اشعار سے غالب کی انفرادیت ظاہر ہوتی ہے۔" غالب نمبر (غالب کی عظمت سرور)

سنہ ۱۸۱۶ء — میں مستقلاً دہلی آ گئے (غالب مہر ص۴۷)

یہاں آنے کے بعد مرزا نے فارسی کے کلام کا خاص طور پر مطالعہ کیا۔ پہلے بیدل اور شعرائے متاخرین فارسی کے رنگ سے متاثر تھے۔ اب عرفی و نظیری کے رنگ نے زیادہ اثر ڈالا۔ دوسری طرف دہلی کے ماحول، سربرآوردہ صاحبان کی صحبتوں نے ان کی ذہنی ترقی میں مدد دیا۔

آہستہ آہستہ خرابات اور بے راہ روی ختم ہونی شروع ہوئی۔

(یادگارِ غالب)

(۲) "باوجود بیدل وغیرہ کی پیروی کے غالب میں نئے پن کا احساس ملتا ہے جو بیدل سے قطعی مختلف ہے جس کا سبب یہ ہے کہ غالب ایک فعال شخصیت تھے۔ ان کا سب سے بڑا سہارا عقل اور ان کے مزاج کا کفر ہے۔ ان کی عقل روحانی تعبیر سے مادی تعبیر کی طرف بڑھتی ہے۔"

(ڈاکٹر خورشید الاسلام، غالب صہ ۱۹۵)

۱۸۱۸ء۔ ۱۹ء ۲۲ یا ۲۳ سال کی عمر میں غالب نے کسی پردہ دار الفت کی یاد میں ایک تاریخی و موثر غزل لکھی۔ یہ غزل ان کی نفسیاتی حالت اور ازدواجی تعلقات کی آئینہ دار ہے۔

ڈاکٹر خورشید غالب صفحہ ۱۴

درد سے میرے ہے تجھ کو بے قراری ہائے ہائے
کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے

تیرے دل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ
تو نے پھر کیوں کی تھی میری غمگساری ہائے ہائے

عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا
عمر کو بھی تو نہیں ہے پائداری ہائے ہائے

اردو کا مشہور قصیدہ حضرت علی کی تعریف میں اسی زمانے

میں لکھا گیا۔

؎ توڑے ہے عجزِ تنک حوصلہ بر روئے زمین
سجدۂ تمثال وہ آئینہ کہیں جس کو جبیں

بعد میں یہ مطلع بدل دیا گیا اب یہ مطلع دیوان میں موجود ہے۔

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

(آثار غالب اکرام صہ ۲۱۳)

یہ قصیدہ ۳۲۔ اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ وہ معرکۃ الآرا قصیدہ ہے جس کی تشبیب میں پہلے وحدت الوجود کا ذکر۔ نارسائی عقلِ انسانی کا تذکرہ۔ بہترین تشبیہات۔ موزونیٔ الفاظ۔ مضمون آفرینی۔ بلند آہنگی۔ معانی اور بہترین گریز کے بعد ہر شعر آہستہ آہستہ بڑھتا چلا جاتا ہے اور ممدوح کے فضائل پر روشنی پڑتی ہے اور جب پڑھنے والا ان اشعار پر پہنچتا ہے ؎

کس سے ہو سکتی ہے مداحیِ ممدوحِ خدا
کس سے ہو سکتی ہے آرائشِ فردوسِ بریں

تیری مدحت کے لئے دل و جان کام و زبان
تری تسلیم کو ہیں لوح و قلم دست و جبیں

دعائیہ کلمات میں مرزا کی جودتِ طبع کے ساتھ نیاز مندی کے اظہار میں گہرا خلوص پایا جاتا ہے ؎

دے دعا کو میری وہ مرتبہ حسن قبول

کہ اجابت کہے ہر حرف پہ سو بار آمین

مداحی کے مدارج کا خیال رکھتے ہوئے چند اشعار کے بعد

دلِ الفت نصیب و سینہ توحید

نگہ جلوہ پرست و نفس صدق گزین

صرف اعدا، اثرِ شعلۂ دودِ دوزخ

وقف احباب گل و سنبل فردوس برین

پر قصیدہ ختم کر دیا گیا ہے (دیوانِ غالب)

مندرجہ ذیل غزلیں بھی ۱۸۱۸ء، ۱۹ء کے قریب کی ہیں۔

غزل نمبر ۷ شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا

تماشائے بہ یک کف بردن دل صد پسند آیا

غزل نمبر ۱۱ سراپا رہن عشق و ناگزیر الفت ہستی

عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

غزل نمبر ۲۸ قطرہ مے بس کہ حیرت سے نفس پرور ہوا

خط جام مے سراسر رشتۂ گوہر ہوا

غزل نمبر ۲۹ اہلِ بینش نے بہ حیرت کدہ شوخی ناز

جوہر آئینہ کو طوطیِ بسمل باندھا

نہ بندھے تشنگی ذوق کے مضموں غالب

گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

غالب خود کہتے ہیں "۱۵ برس کی عمر سے ۲۵ برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھا کیا۔ دس برس میں بڑا دیوان جمع کیا۔"

(عودِ ہندی ص ۱۵۶ غالب)

۱۸۲۱ء میں اردو دیوان مرتب کر لیا تھا جو نسخہ حمیدیہ کی شکل میں موجود ہے۔ جس میں ایک ہزار آٹھ سو نوے اشعار ہیں۔

۱۸۲۲ء - ۲۳ "ریختہ گوی کا خاتمہ اور پارسی سگالی کا آغاز قرار پائے گا۔"

(ص ۱۰ غالب نمبر امتیاز علی عرشی)

غالب اس دور کی عمر تک بیدل و شوکت اور اسیر کی طرز پر لکھتے رہے۔ نواب شمس الامراء کے خط میں جو تقریباً ۱۸۵۴ء کا لکھا ہوا ہے۔ مرزا صاحب نے دعوی کیا ہے "کم و بیش سی سال است کہ اندیشہ پارسی سگال است۔"

ظاہر ہے کہ فارسی شعراء (عرفی و نظیری) کے زیر اثر مرزا کے مضامین میں شگفتگی شروع ہو گئی نفسیاتی شاعری کلام میں ظاہر ہوئی۔ اس دور میں ظرافت کم ہے تصوف زیادہ ہے۔

۱۸۲۴ء تک مرزا کی والدہ زندہ تھیں اور خوب لکھنا پڑھنا جانتی تھیں۔

(غالب نمبر علی گڑھ میگزین)

۱۸۲۵ء مرزا علی بخش برادرِ نسبتی نے مرزا سے استدعا کی کہ فارسی خط و کتابت کے قواعد، القاب و خیریت کے موزوں فقرے ایک جگہ جمع کر دیئے جائیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سہل نویسی

اور سلاستِ بیان مرزا مرحوم کا انتہائی مقصد تھا جو بعد میں
اردو خطوط کی شکل میں جمع ہوا۔

دہلی کے مستقل قیام کے سبب۔ مولوی فضل حق صاحب
اور ان کے رفقا کار کی صحبت نیز نواب الٰہی بخش کی عزیزداری
کے باعث حلقہ احباب وسیع ہوا۔ ان کے کلام میں پختگی
و متانت پیدا ہو گئی اور غرابت کی بھول بھلیوں سے نکل گئے۔

(۱) ذکر غالب مالک رام ص ۴۴، (۲) آثار غالب اکرام ص ۶۰

(۱) مرزا کے خسر مرزا الٰہی بخش معروف اسی سال وفات پاگئے۔

(۲) اسی سال مرزا کا چھوٹا بھائی یوسف دیوانہ ہو گیا۔

(۳) نواب احمد بخش (برادر الٰہی بخش) نے اپنی زندگی میں جائداد
کا انتظام نئے سرے سے کیا کہ اپنی میواتی حرم کی بطن سے نواب
شمس الدین کو ریاست فیروزپور جھرکہ کی گدی دی۔ اور
لوہارو کی جاگیر امین الدین خان وضیاء الدین احمد خان کو دی۔
چونکہ مرزا کی جاگیر نواب شمس الدین کی جاگیر میں شامل تھی اس لئے
نواب شمس الدین سے مرزا کی پنشن متعلق ہوئی۔ مرزا سے نواب
شمس الدین کے تعلقات کشیدہ تھے۔ (خاندانی لحاظ سے
بھی انہیں کمتر سمجھا جاتا تھا) نواب شمس الدین نے مرزا کو کافی
پریشان کیا۔

(۴) اسی سال مرزا کے ساتھ شریک پنشن دوسرے شریک کار

خواجہ حاجی کا انتقال ہو گیا۔ مرزا کا خیال تھا کہ ان کی پنشن
میری جانب منتقل ہو گی لیکن وہ ان کے بیٹوں کی طرف
منتقل ہوئی۔

اس سے قبل مرزا نصر اللہ کے شرکائے حقیقی کے لئے دس
ہزار روپیہ سالانہ پنشن مقرر ہوئی۔ لیکن نواب احمد بخش نے
کسی طرح گورنر جنرل سے ایک شقہ حاصل کر لیا کہ مرزا نصر اللہ
بیگ کے متعلقین کو پانچ ہزار سالانہ ملیں گے اور اس حساب
سے مرزا کے حصہ میں کل ساڑھے سات سو روپے سال حصہ
میں آئے۔ نواب الٰہی بخش کے انتقال کے بعد نواب احمد بخش
کی طرف سے کچھ نواب شمس الدین کے برسرِ اقتدار ہو جانے پر
وہ امداد زائد بھی بند ہو گئی لہٰذا مرزا نواب صاحب کے پاس
سے ناکام واپس آئے۔ یہاں تک کہ بیگم کو تیس روپے
ماہوار کا وظیفہ جو فیروزپور جھرکہ سے ملتا تھا وہ بھی نواب
شمس الدین کے سبب بند ہو گیا۔

(۱) ذکر غالب ص ۲۳ (۲) غالب از مہر ص ۱۴۸ (۳) آثار غالب ص ۶۶
(۴) غالب نمبر علی گڑھ میگزین

۱۸۲۹ء مارچ تا اگست

بقول غالب ؎

آہ از اقربائے بے آزرم
داد از حاکمان بے انصاف

آخر کار مرزا گورنر جنرل کے پاس پنشن کے مقدمہ کا فیصلہ

کرانے کے لئے کلکتہ روانہ ہوگئے (ذکر غالب ص۴۱)
لیکن بقولِ اکرام وہ ۲۷ جون ۱۸۲۷ء کو لکھنؤ سے بھی روانہ
ہوگئے تھے۔ (آثار غالب ص۶) اس کا مطلب یہ ہے
کہ وہ مارچ میں دہلی سے روانہ ہوئے اور دہلی سے لکھنؤ جانے
کی دردناک داستان لکھی ہے ؎

چہرہ اندوہ و بگرد و مژہ آغشتہ بخوں
خود گواہم کہ ز دہلی بچہ عنوان رفتم
اضطرار آئینہ پرداز جلائے وطن است
نہ بدل رفتم ازان بقعہ بل از جان رفتم

دریں قصیدہ غالب نے عرفی کی طرز پر لکھا جس کا مطلع یہ ہے۔

از درِ دوست چہ گویم بچہ عنوان رفتم
ہمہ شوق آمدہ بودم ہمہ حرمان رفتم

ظاہر ہے کہ عرفی کے کلام کی بلند پروازی اور درد و سوز نے
غالب پر گہرا اثر کیا اور پھر جبکہ خود مصائب اٹھائے امید کی
ہلکی سی جھلک لے کر جا رہے ہیں، گویا اس سفر کی تکلیفوں
نے غالب کے کلام کو شراب دو آتشہ کا سا درجہ دیا۔

قیامِ لکھنؤ:۔ لکھنؤ میں قیام کے دوران میں انہوں نے
کافی کوشش کی لیکن مالی امداد کے سلسلہ میں ناسخ کی کوششوں
کے باوجود کامیابی نہ ہو سکی۔ وہ خود کہتے ہیں ؎

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا ہم کو
ہوسِ سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو
قطع سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر
عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو
لئے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالب
جادۂ رہ کششِ کافِ کرم ہے ہم کو
(آثار غالب ص۷)

آخر کار لکھنؤ سے بھی مایوس ہو کر کلکتہ روانہ ہوگئے۔ اور تین
روز میں کانپور پھر وہاں سے باندہ پہنچے۔ قیام باندہ میں چند
غزلیں کسی دوست کو بھیجیں۔

غزل (۱) ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا
(۲) تھی وطن میں شان کیا غالب کہ ہو غربت میں قدر
بے تکلف ہوں وہ مشتِ خس کہ گلخن میں نہیں
(۳) ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے

راستے میں بنارس آیا۔ حسن کے نظاروں نے بہت متاثر کیا۔

تعالی اللہ بنارس چشمِ بد دور
بہشتِ خرم و فردوسِ معمور

۲۵ فروری ۱۸۲۶ء
سہ شنبہ
۱۴ شعبان ۱۲۴۳ھ

کلکتہ پہنچے اور شملہ بازار میں ایک مکان کرایہ پر لیا۔
(ذکر غالب۔ آثارِ غالب ص۴۲ جدید۔ غالب از مہر)

مرزا کے فارسی کلام میں کلکتہ کی کیفیت "ساقی بزم آگہی" کی زبان سے بیان کی گئی ہے۔ ہر چیز کو بطور سوال پیش کرتے ہیں۔ اور ساقی جواب دیتا ہے

گفتمش "چیست منشاء سفرم"
گفت "جور جفائے اہلِ وطن"
گفتم اکنون بگو کہ دہلی چیست
گفت "جان است و این جہانش تن"
حال کلکتہ باز جستم گفت
"بایدا قلیم ہشتمش گفتن"
گفتم "آدم بہم رسد در دے"
گفت "از ہر دیار وا ز ہر فن"
گفتم "این جا چہ کار باید کرد
گفت "قطع نظر ز شعر و سخن"
گفتم "اینان مگر دلے دارند"
گفت "دارند لیک از آہن"
گفتم از بہر داد" مدہ ام
گفت "بگریز و سر بہ سنگ بزن
(بحوالہ غالب از مہر)

قیامِ کلکتہ کی ایک اور غزل کے چند شعر۔

تماں اور قاسم کی تعریف کے سلسلہ میں

دیکھنے میں گرچہ دو، پر ہیں یہ دونوں یار ایک
وضع میں گو ہوئی دو سر، تیغ ہے ذوالفقار ایک
ہم سخن اور ہم زبان حضرت قاسم و تپاں
ایک تپش کا جانشین، درد کا یادگار ایک
نقدِ سخن کے واسطے ایک عیارِ آگہی
شعر کے فن کے واسطے، درد کا یادگار ایک
ایک وفا و مہر میں تازگی بساط دہر
لطف و کرم کے باب میں زینتِ روزگار ایک
لایا ہے مجھ کے یہ غزل شائبہ ریا سے دور
کر کے دل و زبان کو غالب خاکسار ایک

قیامِ کلکتہ کی ایک اور فارسی غزل:

تا فصلے از حقیقت اشیاء نوشتہ ایم
آفاق را مرادف عنقا نوشتہ ایم
(ص۱۲۳ غالب از مہر)

چکنی ڈلی کے متعلق فی البدیہہ قطعہ کہا۔ ایک شعر یہ ہے ؎

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی
زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہئے

قیامِ کلکتہ کے دوران میں ایک مشاعرہ منعقد ہوا۔ اس مشاعرہ میں تین اشعار پر بھرے مجمع میں دو صاحبان نے اعتراض کئے اور اپنے دعویٰ کی دلیل میں قتیل کے اجتہاد کا حوالہ دیا۔ مرزا غالب چوکنے والے کب تھے، انہوں نے قتیل کا نام سن کر ناک بھویں چڑھائیں۔ مشاعرہ میں ہنگامہ برپا ہوگیا۔ کوچہ و بازار میں ہر فرد کی زبان پر یہی قصہ تھا۔ مصلحتِ وقت کی خاطر غالب نے نواب اکبر خان اور مولوی محمد محسن کے ایما پر مثنوی بادِ مخالف لکھی۔

(ذکرِ غالب مالک رام ص۴۶، آثارِ غالب اکرام ص۷۹-۸۱)

اس مثنوی (بادِ مخالف) سے ان کے زورِ بیان اور انفرادیت کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔ مثال کے طور پر اپنی انفرادیت کو یوں واضح کرتے ہیں ؎

زلہ بردارِ کس چرا باشم

من ہمایم مگس چرا باشم

مصلحتِ وقت کی خاطر قتیل کی تعریف، صلح و آشتی کی کوشش کی لیکن باوجود عذر خواہی کے کتنے نشتر پیوست کرتے ہیں ؎

می شوم خویش را بہ صلح دلیل

مے سرایم ثنائے مدح قتیل

گرچہ ایرانیش نخواہم گفت

سعدی ثانیش نخواہم گفت

قیامِ کلکتہ نے غالب کی ادبی زندگی میں چاہے کتنا انقلاب برپا کیا ہو۔ لیکن وہ اپنے مقدمہ پنشن میں ناکام واپس ہوئے۔ اور لارڈ ولیم بنٹنگ نے مرزا کے خلاف رپورٹ کی۔ لہٰذا ہمہ یاس بن کر واپس آگئے۔

(ذکرِ غالب، مالک رام۔ آثارِ غالب ص۵۸ محمد اکرام)

کلکتہ میں لارڈ اینڈریو اسٹرلنگ کی خدمت میں جو قصیدہ پیش کیا اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

مرا دلیست ز دردِ شکستگی لبریز

نہ آرزوئے امیری ز حسرت خاقانی

زلبت فزدن می شود کہ می سوزد

نفس چو رشتۂ شمع بہ بزمِ حیرانی

ز اہلِ دہر دریں روزگارِ بے دردی

بہ عیدِ عشرتِ خویشم نمودہ قربانی

غریب نیست بہ دردم رسیدن ہا

نہ مدعی عربی و نہ من خراسانی

بہ دادگاہ رسیدم چنانکہ دانستم

بہ روز می بہ دادِ غریباں چنانکہ می دانی

(غالب از مہر ص۱۵۳)

ستمبر ۱۸۲۹ء
اس ماہ کے آخر یا اوائل اکتوبر میں وہ کلکتہ سے روانہ ہوئے اور

۲۹ر نومبر ۱۸۲۹ء
۲۹ر نومبر کو دہلی پہنچے (۲۰ر جمادی الثانی ۱۲۴۵ھ)

(بحوالہ غالب از مہر)

۱۸۳۰ء
یہ سال امید و یاس کا تھا اپیل کا فیصلہ ابھی نہیں ہوا تھا۔

۲۷ر جنوری ۱۸۳۱ء
کلکتہ سے واپسی کے بعد نواب شمس الدین اور ریذیڈنٹ دہلی کی سازش سے غالب کے خلاف فیصلہ ہو گیا۔ (نواب گورنر جنرل نے جو دورے پر دہلی آئے تھے، ریذیڈنٹ کی رپورٹ کی بنا پر دوسرے شق کو مستند مانا اور ان کے خلاف فیصلہ صادر کر گئے۔

۱۸۲۳ء تا ۱۸۳۳ء
ولیم فریزر دہلی کے ریذیڈنٹ تھے۔ انہوں نے نواب شمس الدین و نواب امین الدین کے جھگڑوں کے سلسلہ میں نواب امین الدین کا ساتھ دیا۔ جبکہ نواب احمد بخش کی وصیت کے خلاف انہوں نے آواز اٹھائی اور ۶۲۳ میں لوہارو کا نظم و نسق اس شرط پر ان کے سپرد کر دیا گیا کہ وہ دونوں بھائیوں کے گذارہ کے لئے چھبیس ہزار سالانہ ادا کرتے رہیں گے۔

اسی سال مرزا غالب نے نواب حامد علی خان (داماد نواب اعتماد الدولہ، نواب فضل علی خان وزیر اودھ) کی فرمائش پر امام باڑہ کا قطعہ تاریخ کہا جو نواب حامد علی خان صاحب نے

اپنے وطن رسول پور بر شط (دال برست) ضلع کرنال میں تعمیر کیا تھا۔

گلی ز گلبن حیدر شگفت در عالم
بباغ آلِ نبی حامد علی بسخا
بابر فیض دل سنگ را نماید آب
بلطف بلبل تصویر را کند گویا
بنا نمود چون قصرے پے عزائے حسین
ز ہر رواق بلندات نالۂ زہرا
چون آہ داشت ستون نقش دگر خم محراب
دہد بباد ہلال مہ محرم را
برائے سال بنائش بگریہ ہاتف گفت
مکان ماتم آل عبا متین بنا

(غیر مطبوعہ)

بحوالہ "درہ باہرہ" مرتبہ مولوی رفیق علی برکتی مرحوم غیر مطبوعہ نوشتہ ۱۳۰۱ھ

یہ زمانہ مرزا پر سخت مصیبتوں کا تھا۔ قرض خواہوں سے ڈر کر گھر میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ بلکہ وہ اس امر پر بھی تیار ہو گئے کہ ہندوستان کے کسی والئی ریاست کی ملازمت کر لیں۔ لیکن فطری خودداری کے باعث کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانا کسرِ شان

سمجھتے تھے۔ (ماخذ غالب ۲ بنام خواجہ فخر اللہ)

"حالیا بر آن سرم کہ اگر کسے از جاہ مندان ہندوستان بمن پردازند دہنجار اندازہ نگاہ داری وقانون پایہ شناسی مرا بہ سوئے خود خوانند"

دل بہ پچاک طرہ دل آویز گردد رمش بندے ورخت سفر بہ سایہ دیوار قصر و ارائش کشائے۔

ستمبر یا اکتوبر سنہ ۱۸۳۴ء
میں جب نواب امین الدین خان اپنے مقدمہ کے سلسلہ میں کلکتہ روانہ ہوئے تاکہ نواب شمس الدین کے خلاف اپیل کریں تو غالب نے انہیں کئی تعارفی خطوط دیئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کی دلی دعائیں نواب امین الدین کے ساتھ تھیں۔ اور مرزا نواب شمس الدین کے خلاف تھے۔
(بقول مہر ستمبر میں گئے۔ بقول اکرام اکتوبر میں گئے)

اس سال کے آخر میں مرزا نے دربارِ مغلیہ میں داخل ہونے کی کوشش کی اور شہزادہ سلیم خلف اکبر شاہ کی تعریف میں ایک قصیدہ عید بقر کے موقع پر پیش کیا۔

زہے مناسبت طبع شاہزادہ سلیم
بہ فیض تربیت بادشاہِ ہفت اقلیم

فروری سنہ ۱۸۳۵ء
غالب کے خلاف ایک دیوانی مقدمہ میں پانچ ہزار روپے کی ڈگری ہو گئی لہذا غالب نے گھر سے نکلنا چھوڑ دیا۔
(ذکر غالب صفحہ ۵۴)

مارچ سنہ ۱۸۳۵ء
ولیم فریزر، ریذیڈنٹ دہلی گولی سے ہلاک ہوئے۔ مرزا کی دوستی ولیم سے بہت تھی اور نواب شمس الدین و مرزا صاحب کے تعلقات پنشن کے سلسلہ میں کشیدہ تھے (س لئے) عوام کی ہمدردیاں نواب صاحب کے ساتھ تھیں۔

۲، ۸ اکتوبر سنہ ۱۸۳۵ء
نواب شمس الدین کو پھانسی کی سزا ملی۔ مرزا صاحب کے متعلق شبہ تھا کہ انہوں نے نواب صاحب کے خلاف سازش میں حصہ لیا ہے (ذکر غالب۔ آثار غالب صفحہ ۸۶)

مرزا صاحب کے قلعہ سے مراسم کا سلسلہ اس فارسی قصیدے سے ملتا ہے جو کہ اکبر شاہ ثانی کی مدح میں لکھا گیا۔ اس کا مطلع ہے

دریں زمانہ کہ کلک ز صد نگار حکیم
ہزار و دو صد و پنجاہ راند در تقویم
(حالات غالب صفحہ ۸۶)

۱۶ دسمبر سنہ ۱۸۳۵ء
غالب نے مٹکاف ریذیڈنٹ کے خلاف شکایت کی۔

اس زمانہ کے قریب قریب میخانہ آرزو، مرزا کا فارسی دیوان مرتب ہو چکا تھا۔ نواب امین الدین والی لوہارو کی فرمائش پر مرتب کیا گیا تھا۔

۱۸ جون سنہ ۱۸۳۶ء
گورنر مغربی و شمالی نے فیصلہ دیا کہ ۷ جون ۱۸۰۶ء کے شقے کی رو سے جو ساڑھے سات سو سالانہ انہیں ملتے ہیں، وہی درست ہیں۔

۱۳ر جولائی — کو غالب نے فیروز پور جھرکہ کے خلاف دعویٰ کر دیا۔

۲۶ر اگست — کو ریذیڈنٹ کے خلاف دوبارہ درخواست دی۔

اسی سال غالب کا مقدمہ کورٹ آف ڈائرکٹر کی عدالت میں
پیش ہونے کے لئے جا رہا ہے۔ غالب لکھ رہے ہیں۔

بہ صدر می رود این بازپرس بسم اللہ
ہمیں مراد من است و جز این مرادم نیست

سنہ ۱۸۳۷ء — اکبر شاہ کا انتقال ہوا اور ظفر شاہ بادشاہ ہوئے۔ مرزا نے سال
جلوس کے موقع پر فارسی قصیدہ لکھا جس میں قرب شاہ کی
خواہش تھی۔

خواہم قرب شاہ و لیکن دریں مراد
عبرت ز نامرادی سنجر گرفتہ ایم

معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے حریف مرزا کی دال گلنے نہیں دیتے
تھے۔ دوسرے قصیدہ میں (جو بہادر شاہ کی مدح میں فارسی
کا پہلا قصیدہ ہے) اپنی وفاداری و عقیدت کا اظہار اس طرح
کرتے ہیں۔

گفتم مدیت دوست بقران برابر است
نازم بعجز خویش کہ با ایمان برابر است

اسی سال فارسی دیوان کا خاتمہ لکھا گیا۔ ان کی عمر اکتالیس سال
کی ہو چکی تھی۔ اسی سال نصیر الدین شاہ اودھ چل بسے اور

امجد علی شاہ جانشین ہوئے۔ مرزا نے ایک قصیدہ لکھا۔

باین کہ تاب ناز نکویان نداشتم
بدگر دید کہ جور و جفا کرد روزگار

سنہ ۳۸ء — کے قریب فارسی دیوان چھپا

سنہ ۴۰ء — پنج آہنگ مکمل طور پر مرتب ہوئی۔ آہنگ اول میں فارسی
خطوط کے متعلق وہ سطور جو سفر بھرت پور میں لکھی گئی۔
آہنگ دوم میں فارسی مصادر و مصطلحات ہیں۔
آہنگ سوم میں اپنے فارسی دیوان کے کئی اشعار انتخاب کئے
خطوط نویسی کا محل بتایا ہے۔
آہنگ چہارم میں تقاریظ کتب اور متفرق مضامین ہیں۔
آہنگ پنجم۔ یہ فارسی خطوط، اردو خطوط کی طرح کافی اہمیت
رکھتے ہیں۔ چند ایسی چیزیں بھی ہیں جن سے زمانہ کے واقعات
کا پتہ چلتا ہے۔ معزز ہستیوں کے نام بھی۔ جن سے مرزا صاحب
کو پورا تعاون حاصل تھا۔ اس کے علاوہ آخر کے چند خطوط
میں تکالیف و حالات کا بھی ذکر ملتا ہے۔

اکتوبر سنہ ۱۸۴۱ء — دیوان ریختہ سر سید کے بھائی مولانا سید محمد کے پریس سید المطابع
سے شائع ہوا۔ غالباً اس میں ۱۰۷۲ اشعار تھے۔ اور
نواب ضیاء الدین کی تقریظ تھی (آثار غالب۔ اکرام)
بقول مالک رام "یہ نسخہ ۱۰۸ صفحہ کو محیط ہے۔ جس میں

۱۰۹۵ اشعار ہیں۔ اس کے شروع میں فارسی کا دیباچہ اور آخر میں نواب ضیاء الدین کی تقریظ ہے جو ۱۲۵۷ھ میں لکھی۔ ان میں ۱۰۷۰ اشعار کی تعداد تھی۔ مگر جب شائع ہوا تو ۲۵ اشعار کا اضافہ کر دیا گیا۔ (صاحب نادرات کے خیال کے مطابق ۴۳، ۱۸۴۲ء میں فخر المطابع سے طبع ہوا۔ صہ ۹۴ نادرات غالب)

مولانا امتیاز علی عرشی کی تحقیق ہے کہ مطبع سید الاخبار کے نام سے مشہور ہے۔ یہ شعبان ۱۲۰۷ھ یا اکتوبر ۱۸۴۱ء میں شائع ہوا۔ ایک نسخہ پبلک لائبریری میں محفوظ ہے جس کے سرِ ورق پر عبارت اس طرح پانچ سطروں میں لکھی ہے۔

دیوان اسد اللہ خان صاحب غالب تخلص

مرزا نوشہ کا دیوان دہلی میں سید محمد خان بہادر کے چھاپہ خانہ کے لیتھوگرافک پریس میں شہر شعبان ۱۲۰۷ھ مطابق اکتوبر ۱۸۴۱ء کو سید عبد الغفور کے اہتمام سے چھپا۔"

اس کے پہلے صفحہ پر ۱۵ غلطیوں کا ایک غلط نامہ دیا گیا ہے ہر صفحے میں ۱۵ سطریں ہیں۔ کاغذ پرانی وضع کا دیسی بانس کا بنا ہوا ہے۔ کتاب کا ناپ ۸ ½ × ۵ ½ انچ اور کتابت کا ۶ ½ × ۳ ½ ہے۔

(مولانا امتیاز علی صہ ۱۱۴، ۱۱۵ غالب نمبر علی گڑھ میگزین)

۴۴ء

مرزا کی اس زمانے کی غزلیں پہلے دور کی غزلوں کی بہ نسبت بہت بلند پایہ ہیں۔ زمانہ کی پیہم مصیبتوں اور تکالیف نے ان کے نظریۂ حیات میں تبدیلی کر دی۔ ان کی غزلوں میں وہ خیالی اور دور از کار تشبیہیں نہیں، بلکہ ادبیت کی جان ہونے کے علاوہ ان کی وسعتِ نظر اور دقتِ نظر کا پتہ چلتا ہے۔ عرفی و نظیری کی غزلوں پر غزلیں لکھی جانے لگیں۔ دامانِ اردو تنگ نظر آیا۔ جولانیٔ طبع کے لئے فارسی ہی مناسب سمجھی گئی۔ انہیں اپنے فارسی اشعار پر ناز ہونے لگا۔ ان کے احساسات نے الفاظ کا جامہ پہنا اور اب زوردار الفاظ میں یوں کہنے لگے۔

دبیرم شاعرم رندم ندیمم شیوہ ہا دارم
گر فتم رحم بر فریاد و انعامم نمی آید

مرزا کے لئے یہ سال اور بھی پریشانیوں کا تھا۔ اب وہ مقدمہ پنشن کے سلسلہ میں مایوس ہو گئے تھے۔ اس پریشانی کے عالم میں ان کی نگاہیں لال قلعہ کی طرف بار بار اٹھتی تھیں چند مرتبہ معذرت آمیز قصائد بھی دربار میں پیش کئے لیکن کام نہ چل سکا۔ یہ قصیدہ بھی اسی سلسلہ میں ہے جو شہزادہ سلیم کی مدح کے باعث ظفر شاہ کے دل میں ایک کشیدگی کا اثر پیدا ہو گیا تھا چونکہ مرزا نے شہزادہ سلیم کے متعلق

ولی عہد ہونے کے امکانات ظاہر کر دیئے تھے)

ردیفِ شعر ازان کردم اختیار گرہ

کہ از منت بر ابروئے شہریار گرہ

سنہ ۲۵ء

میں اردو کی غزلیں بھی لکھیں گئیں مشاعروں میں پڑھی گئیں۔ مرزا کی ادبی شہرت دن بدن بڑھتی جا رہی تھی۔ اسی لئے انہوں نے اپنے حریفوں کو ان اشعار میں مخاطب کیا ہے جو ان کے خیال کے مطابق دربار میں بازیابی کے لئے مزاحمت کر رہا تھا۔ قطعہ کا زور بتا رہا ہے کہ وہ اشعار کے ذریعہ رجز خوانی کر رہے تھے۔

ای کہ در بزم شہنشہ سخن ایں گفتہ ای

فارسی بین تا بہ بینی نقشہای رنگ رنگ

بگذر از مجموعہ اردو کہ بے رنگ من است

فارسی بین تا بدانی کاندر اقلیم خیال

شاہ می داند کہ من مدح ثنا ہم ما کہ نیست

گر تو اندیشی کہ این دکتان و ترنگ من است

(آثار غالب ص ۱۱۳)

اسی سال مرزا کا فارسی دیوان نواب ضیاء الدین احمد خان بہادر منشی نور الدین کے مطبع دار السلام دہلی میں چھپا۔ اس میں ۶۶۷۲۔ اشعار ہیں (آثارِ غالب ص ۲۴۰)

اسی سال سر سید احمد خان نے آثار الصنادید کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں غالب کی کمال شاعری کا اعتراف کیا۔ سر سید احمد خان نے آئینِ اکبری کی تصحیح کے بعد غالب سے فرمائش کی تھی کہ وہ اس پر تقریظ لکھ دیں۔ اس کے جواب میں غالب نے ایک نظم سر سید احمد خان کے پاس لکھ بھیجی جس میں انگریزی حکومت کے آئین اور مغربی تمدن کے مادی وسائل اور اس کے اصول کو سراہا ہے، جو انسان کے بقائے نفس اور حصولِ راحت میں مدد دیتے ہیں۔

صاحبانِ انگلستان را نگر

شیوہ و اندازِ بیان را نگر

زین ہنرمندان ہنر دستی گرفت

سعی بر پیشانی پیشی گرفت

داد و دانش را بہم پیوستہ اند

ہند را صد گونہ آئین بستہ اند

آتشے کز سنگ بیرون آورند

این ہنرمندان زخس چون آورند

اسی سال مثنوی ابر گہربار لکھی جس میں ارادہ تھا کہ شاہنامہ اسلام کی طرح ابتدائی سرگرمیوں کو نظم کر دیں۔

زفر دو دیم نکتہ انگیز تر   مرغِ سحر خوانِ سحر خیز تر

باقبال ایمان ایزوئے دین   سخن رانم وسیدالمرسلین

۱۸۴۶ء

(۱) مرزا کی توقعات اب خاص طور سے قلعہ سے وابستہ ہوگئی تھیں غالباً یہ قصیدۂ معذرت اسی سال کے شروع میں لکھا گیا۔ جس کا مطلع یہ ہے۔

گفتم حدیث دوست بقرآن برابرست
نازم بکفر خویش کہ ایمان براہ راست

آخر میں معذرت چاہی ہے۔

پوزش پذیر ومکرمت انگار کز توام
خود یک نگاہ بہ لطف نمایاں برابراست
آرے قبول عذر گنہ از گناہگار
باصد ہزار بخشش و احسان برابراست

(۲) اسی سال جب خالصہ افواج کو انگریزوں نے شکست دی تو مرزا نے لارڈ ہارڈنگ کی تعریف میں قصیدہ لکھا جس سے ان کی دلی مسرت کا اظہار ہوتا ہے۔

گزاف شیوۂ من نیست راست می گویم
دریں زمانہ مرا بودے دار زمان شباب
بہ شکستن کفار بستے بہ نبرد
مکرر پے   نیت حصول ثواب

۳۰ر مئی ۱۸۴۷ء — میں مرزا نے وقت گذاری وتفنن طبع کی خاطر قمار بازی کی طرف توجہ کی۔ آخر کار مرزا گرفتار ہوئے۔ (ذکر غالب ص۶۳)

وقت شب

۲۵ر جون ۱۸۴۷ء — کو بہادر شاہ کی طرف سے ایک سفارشی خط لکھا گیا۔

۲ر جولائی ۱۸۴۷ء — چھ ماہ قید بامشقت اور دو سو روپیہ جرمانہ کی سزا کا حکم ملا۔ بصورت عدم ادائیگی چھ ماہ مزید قید۔ اگر اصل جرمانہ علاوہ پچاس روپے ادا کریں تو معاف ہو جائے گی۔

عام لوگوں نے مرزا سے علیحدگی اختیار کر لی۔ خصوصاً خاندان لوہارو نے تو یہ اطلاع اخبار میں شائع کرائی مرزا سے تمام تعلقات کی علیحدگی کا اظہار کیا۔ البتہ تمام مصیبتوں کے درمیان نواب شیفتہ کی ہمدردیاں لائق ستائش ہیں کہ مرزا کی رہائی کے لئے ہر ممکن کوشش کی۔ اخراجات ادا کئے۔ قید خانے میں دلجوئی کے لئے برابر جاتے رہے۔ اس زمانہ کا "حبسیہ" فارسی کا ادبی شاہکار ہے، ایک بند میں اپنے داخلہ زنداں کا منظر پیش کرتے ہیں (ذکر غالب ص۶۵۔ آثار غالب)

پاسباناں بہم آید کہ من می آیم
در زنداں بکشاید کہ من می آیم
ہر کہ دیدے   سپاسم گفتم
خیر مقدم بہ سر آید کہ من می آیم
جادہ نشاسم وزرانبوہ شما می ترسم

راہم از دور نماید کہ من می آیم

تا بر دروازۂ زندان پئے آوردن من

قدمے رنجہ نماید کہ من می آیم

فارسی کا یہ ترکیب بند جس موقع پر لکھا گیا ہے، اردو کی شاعری کوئی ایسا شاہکار پیش نہ کر سکی۔ حقیقت یہ ہے کہ زمانے کی سختیاں اور چیرہ دستیاں مرزا کی ذہنی صلاحیتوں کو اجاگر کر رہی تھیں۔ اور بقول اکرام "عارفانہ چشم بصیرت کا عطیہ تھا جس نے ان کے لئے سختی و سستی، رنج و الم سب کو ہموار کر دیا تھا۔ اسی طرح نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کی کوششوں کو بھی اس قطعہ میں سراہا گیا ہے

خود چرا خون خورم از غم کہ بہ غم خوارئی من

رحمتِ حق بہ لباسِ بشر آمد گوئی

مصطفیٰ خان کہ دریں واقعہ غم خوار من است

گر بمیریم چہ غم از مرگ عزادار من است

(آثار غالب۔ ذکر غالب)

نواب مصطفیٰ خان کی بے لوث جدوجہد نے مرزا کو جلد قید سے نجات دلائی۔ چھوٹنے کے بعد مولانا نصیر الدین کالے شاہ صاحب (جو بہادر شاہ کے پیر تھے) مقیم ہوئے۔

مئی ۱۸۴۷ء — میں مرزا کا اردو دیوان دوسری مرتبہ شائع ہوا (آثار غالب ص ۲۴۰)

(مطبوعہ نور الدین۔ دار السلام حوض قاضی) ۱۳۲ ذکر غالب۔ اس کے اول مرزا کا اپنا فارسی دیباچہ اور آخر میں نیر نشاں کی تقریظ ہے۔ اشعار کی تعداد ۱۰۹۵ ہے۔ (نادرات غالب ۹۴)

اسی سال منشی نبی بخش حقیر مرزا کے ہاں اقامت پذیر ہوئے۔

۱۸۴۸ء — مرزا دربار میں حاضر ہونے لگے۔ قصیدہ پڑھتے اور انعام پاتے۔

فروری ۱۸۴۸ء — پہلا مشاعرہ ۲۰ فروری ۱۸۴۸ء کو ہوا۔

۹ مارچ ۱۸۴۸ء — اسی سال مرزا نے خط و کتابت اردو میں شروع کی۔ پہلا خط ۹ مارچ ۱۸۴۸ء کو لکھا گیا۔

۴ اگست ۱۸۴۹ء / ۱۲ رمضان ۱۲۶۵ھ — پنج آہنگ مطبع سلطانی میں طبع ہوئی۔ باہتمام حکیم غلام نجف خان بہادر اس چھوٹی سی تقطیع میں ۴۹۲ صفحے ہیں اور قیمت چار روپے تھی۔

۵ مئی ۱۸۵۰ء — میں واجد علی شاہ کی خدمت میں قطب الدین کی وساطت سے قصیدہ پیش کیا گیا۔

۴ جولائی — مرزا نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ کے خطاب سے سرفراز ہوئے اور خلعت سے بھی۔ اور چھ سو روپے سالانہ پر شاہانِ تیموری کی تاریخ نویسی پر مامور ہوئے۔ اس ملازمت میں حکیم احسن اللہ کے علاوہ شیخ نصیر الدین نے بھی مدد کی۔

۱۵ جولائی — کے اخبار اسعد الاخبار آگرہ میں مذکورہ بالا خبر شائع ہوئی۔ (آثار غالب ص ۱۱۶)

اسی سال کے آخر میں ولی عہد شاہ شہزادہ فتح الملک نے ان کی شاگردی اختیار کی اور چار سو روپے سالانہ مقرر کیا۔
۱۸۵۰ء سے جو احتراق شروع تھا وہ ۱۸۵۱ء تک باقی رہا۔

جنوری ۱۸۵۱ء — تک امیر تیمور سے بابر تک کا حال مکمل لکھا۔ بہادر شاہ کی درگاہ میں غالب کا تقرب خاص ہوا۔ لیکن چھ مہینے کی تنخواہ ملنے کی شکایت باقی رہی (نادرات غالب ص۸۵)

میری تنخواہ کیجئے ماہ بماہ تا نہ ہو مجھ کو زندگی دشوار

(ذکر غالب ص۴۸)

مارچ ۱۸۵۱ء — (۱) تیمور، بابر و ہمایوں کا حال لکھ چکے، اکبر کا حال باقی ہے۔
(۲) مرزا نے ایک قصیدہ رودکی طرز پر لکھا۔ جس میں فتح الملک کی تعریف کی تھی۔

داور سلطان نشان آید ہمی مرد گیتی نشان آید ہمی
شہر یاران نکتہ دانان بودہ اند شہر یار نکتہ دان آید ہمی

اپریل ۱۸۵۱ء — مرزا نے نئی غزل لکھی۔

کہتے تو ہو تم سب کہ بت غالیہ مو آئے
اک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی وہ آئے

اس انجمن ناز کی کیا بات ہے غالب
ہم بھی دان ادا تری تقدیر کو رو آئے

(نادراتِ غالب ص۱۲)

(۲) نکتہ چیں ہے غمِ دل اُس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

جولائی ۱۸۵۱ء — "ان دنوں بہ سبب عید کے قصیدے کی فکر کے مجھ کو فرصتِ تحریر نہیں ملی۔ قصیدے جب چھپ کر آئیں گے تو موافقِ معمول آپ کی خدمت میں ارسال کروں گا۔"

(نادراتِ غالب ص۱۶)

بارے عید ہو چکی، قصیدہ پڑھ چکا۔ مدح بہادر شاہ میں یہ سترھواں قصیدہ ہے۔

گفتم حدیث شاہ بقران برابر است
نازم بجفر خود کہ بایمان برابر است

اس مہینے کے آخر تک آزار میں مبتلا رہے۔

۴ اگست — (۱) احتراق کی تکلیف میں مبتلا ہیں۔ (نادرات غالب)
(۲) مخدوم زادہ بھی تندرست ہو چلا ہے (خطوط بنام منشی نبی بخش)

۶ ستمبر ۱۸۵۱ء — (۱) مرزا کے پاؤں میں دو ایک پھوڑے نکلے ہیں۔ اس عذر لنگ سے بادشاہ کے پاس قطب شاہ کی درگاہ میں نہیں گئے (نادرات)
(۲) اکبر شاہ کا حال ابھی تک شروع نہیں کیا گیا۔

اسی سال کے آخر میں نواب زینت محل کے ایما پر ولیعہد کی شادی کے موقع پر سہرا لکھا جس کا مقطع مبارزطلبی پر مشتمل تھا

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں
دیکھیں کہہ دے کوئی اس سہرے سے بڑھ کر سہرا

ذوق خاقانی ہند تھے اور سلطان الشعراء۔ استاد شاہ۔
بادشاہ کو یہ امر ناگوار گزرا۔ آخر غالب کو معذرت نامہ لکھنا پڑا۔
جو تاکید الذم مشابہ بہ مدح تھا۔

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

مقطع میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات
مقصود اس سے قطعِ محبت نہیں مجھے

روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ
سودا نہیں جنوں نہیں وحشت نہیں مجھے

صادق ہوں اپنے قول میں غالب خدا گواہ
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

اسی زمانہ میں مرزا نے ایک غزل لکھی جس میں بادشاہ کے ساتھ
حج جانے کی خواہش تھی جس کا مقطع یہ ہے۔

غزل ۲۲۹ — غالب اگر سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں
حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی۔

جنوری ۵۲ء — زوجہ عارف کا انتقال درد گردہ سے ہوا۔ عارف کو ازحد قلق
ہوا۔

مارچ ۵۲ء — مرزا کو وجع الصدر کی تکلیف ہے اور آشوب چشم کی بھی۔
چار پہر چھ پہر رہتا ہے پھر رفع ہو جاتا ہے۔ حکیم احسن اللہ
خان چارہ گر ہیں۔ اس زمانے میں مسہل ہو رہے ہیں۔
(نادرات)

۲۲ مارچ دو شنبہ — کالے خاں کے مکان سے اٹھ گئے اور بلی ماروں کے
محلے میں ایک حویلی کرایہ پر لے کر اس میں رہتے ہیں۔
(بنام تفتہ ص ۱۲۷ خطوط غالب از مہر)

اپریل ۵۲ء، جمادی الآخر ۱۲٦ھ — زین العابدین عارف نے جوانی میں وفات پائی۔ مرزا
نے درد و غم کے آنسو بہائے۔

ہاں اے فلک پیر جواں تھا ابھی عارف

اسی کے لئے مرزا نے کہا تھا ؎

آں پسندیدہ خوئے عارف نام
کہ رخش شمع دودمان من است

۲۱ مئی ۵۲ء بروز جمعہ — (۱) "اجزائے تاریخ تیموریہ" لکھے جا رہے ہیں۔ چنانچہ
تین جز لکھے جا چکے۔ چھوٹی تقطیع خوش خط آئندہ پر گیارہ
سطر لکھے جاتے ہیں۔ ایک ثلث تحریر ختم ہوئی، دو
ثلث باقی ہے۔ (نادرات، خط بنام منشی نبی بخش)

(۲) "مومن کو مرے ہوئے آج دسواں دن ہے، ہم عمر
مرے جاتے ہیں۔ مومن خان میرا ہم عصر تھا۔ اور یار بھی تھا۔

بیالیس تینتالیس برس ہوئے یعنی چودہ چودہ برس کی میری اور اس مرحوم کی عمر تھی کہ مجھ میں اور اس میں رابطہ پیدا ہوا۔ اس عرصہ میں کبھی رنج و ملال درمیان میں نہیں آیا۔ حضرت چالیس چالیس برس کا دشمن بھی نہیں پیدا ہوتا۔ دوست تو کہاں آتا ہے۔ یہ شخص بھی اپنی وضع کا اچھا کہنے والا تھا۔ طبیعت اس کی معنی آفریں تھی۔"

(بنام نبی بخش۔ نادرات)

شرطست کہ روئے دل خراشم ہمہ عمر
خوں نابہ برخ زدیدہ پاشم ہمہ عمر
کافر باشم اگر بمرگ مومن
چوں کعبہ سیہ پوش نہ باشم ہمہ عمر

جون ۵۲ء — دوسرا مشاعرہ قلعہ میں ہوا۔ مرزا نے غزل کہی ؎

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

اس مہینے میں حضرت آدم سے چنگیز تک کے حالات فارسی میں لکھ کر مع دیباچہ واپس حکیم صاحب کو کر دیا۔

۱۹ر نومبر ۵۲ء — اس سال واجد علی شاہ کے دربار سے انہیں مدح کا صلہ ملا۔ تاریخ تیموریہ لکھ رہے ہیں۔ دفتر شاہی کے حال میں فردوس منزل شاہ عالم کا کاغذ اور لارڈ لیک کے عرائض

اور بادشاہوں کے شقوں کی نقل موجود ہیں۔ باقی سب گاؤ خورد ہو گیا۔ کارپردازان دفتر شاہی حالات اردو میں لکھ کر بھیجتے ہیں۔

دسمبر ۵۲ء — میں اردو دیوان بہ تکلیف جانی جی کے ایما پر لکھوایا۔

(صہ ۱۰۳۔ نادرات غالب)

جنوری ۵۳ء — (۱) اور اوائل جنوری میں مہاراجہ جے پور کی خدمت میں پیش ہوا۔ مہاراجہ نے ازحد پسند کیا۔
(۲) مرزا غالب نے پانچ کلیات اجارہ بہ منشی نبی بخش حقیر کو بھیجا۔

فروری ۵۳ء — تیسرا مشاعرہ ہوا پہلے ذوق نے بادشاہ کی غزل سنائی پھر شہزادہ خضر سلطان نے پھر دوسرے شہزادوں نے۔

(نادرات غالب صہ ۹۹)

۲۵ر فروری ۵۳ء — غالب وجع الصدر (سینے کے درد) میں مبتلا ہیں۔

مارچ ۵۳ء — میں ان کو مہاراجہ جے پور سے پانسو روپے نقد اور خلعت تجویز ہوا۔

۱۰ر اپریل ۵۳ء — چوتھا مشاعرہ قلعہ میں ہوا۔ مرزا نے اس مصرعہ پر غزل کہی۔

جون ۵۳ء — ۱۲ر جون کو مرزا کو مہاراجہ کی طرف سے رقم مذکور کی ہنڈی پہنچی۔

(نادرات ۹۹)

پنج آہنگ دوسری مرتبہ مطبع دارالسلام میں شائع ہوا۔

(ذکر غالب)

جولائی ۵۳ء قلعہ میں پانچواں مشاعرہ ہو رہا ہے

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

اسی سال بادشاہ بہت سخت بیمار ہوئے۔ غالب پریشان ہوئے۔

اسی سال بادشاہ کے ایما پر منشی میر لال نے ایک صوفیانہ رسالہ لکھا۔ مرزا نے اس پر اردو میں دیباچہ تحریر کیا۔

۷؍اپریل ۵۳ء اردو کا مخمس بہادر شاہ کی غزل پر تضمین ہے کہ

گھستے گھستے پاؤں میں زنجیر آدھی رہ گئی
مر گئے پر قبر کی تعمیر آدھی رہ گئی
سب ہی پڑھتا کاش کیوں تکبیر آدھی رہ گئی
کھینچ کے قاتل جب تری شمشیر آدھی رہ گئی
"غم سے جان عاشقِ دلگیر آدھی رہ گئی"

ناگہاں یاد آ گئی مجھ کو یارب، کب کی بات
کچھ نہیں کہتا کسی سے، شب کی بات
کس لئے تجھ سے چھپاؤں ہاں وہ برسوں شب کی بات
نامہ بر جلدی میں تیری وہ جو تھی مطلب کی بات
خط میں آدھی ہو سکی تحریر آدھی رہ گئی
تم جو فرماتے ہو دیکھ اے غالبِ آشفتہ سر

ہم نہ تجھ کو منع کرتے تھے گیا کیوں اس کے گھر
جان کی پاؤں امان، باتیں یہ سب سچ ہیں مگر
دل نے کی ساری خرابی، لے گیا مجھ کو ظفر
واں کے جانے میں مری توقیر آدھی رہ گئی

(غالب نمبر علی گڑھ میگزین)

یہ تضمین اردو اخبار میں چھپی۔

(۲) "بادشاہ نے قلعہ میں مشاعرہ مقرر کیا ہے۔ مہینے میں دو بار ہوتا ہے۔ پندرھویں کو اور انتیسویں کو۔ مصرعِ طرح تھا خمارِ عشق نہیں ہے کس قدر کیا کہیئے۔ (بزبانی غالب)

ایک دو شعر اس غزل کے سنئے۔

دیا دل اگر اس کو بشر ہے کیا کہیئے
ہوا رقیب تو ہو نامہ بر ہے کیا کہیئے
کہا یہ کس نے کہ غالب برا نہیں لیکن
سوائے اس کے کہ آشفتہ سر ہے کیا کہیئے

(نادراتِ غالب ص۳۲)

دوسری غزل کا شعر۔

سفینہ جب کہ کنارے پہ آ لگا غالب
خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیئے

۲۹ مئی ۵۳ء بروز اتوار۔ (۱) گرمی کا حال کیا پوچھتے ہو میرا تو یعنی وہ حال ہے

جو زبان سے پانی پینے والوں جانوروں کا ہوتا ہے۔
بقول ظہوری۔
حال سگ حال گربہ حال شغال۔ جب مجھ کو اس موسم میں دیکھو تو جانو کہ اس موسم میں کیوں کر زندگی بسر کرتا ہوں"۔

"رسوم سرکاری کی رقم بقیہ مرزا کے ذمہ پانچسو روپے نکلی۔ لہذا انگریزی تنخواہ سے پانچ روپے بطور قسط مقرر کر دیا۔" (غالب بنام منشی بخش حقیر از نادرات غالب ص۳۳)

(۲) غالب تین دن تک قلعہ نہ گئے۔

۹ر جون پنجشنبہ ۵۳ء — مرزا نے خط میں کاغذ کی جمع کو اخذ لکھی۔ جے پور دربار سے مرزا کو پانچ سو روپے ملے۔

۲۲ر جون مطابق ۱۴ر رمضان — گرمی سخت پڑ رہی تھی۔ رمضان کی چھ یا سات کو بارش ہوئی۔ درمیان رمضان میں ابر گھر رہتا ہے۔ دھوپ تیز ہے۔

(۲) غالب نے اردو اخبار منگوا کر بنارس کے بلوے کا حال پڑھا۔

جولائی ۵۳ء — (۱) پانچواں مشاعرہ قلعہ میں ہوا۔ غالب نے غزل پڑھی۔

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

(۲) اسی سال بادشاہ بیمار ہوئے، غالب سخت پریشان ہوئے۔

(۳) اسی سال بہادر شاہ کے ایما پر منشی میر لال نے ایک صوفیانہ رسالہ لکھا۔ اس پر مرزا نے اردو دیباچہ تحریر کیا۔ (آثار غالب ص۱۲۳)

"یہ رسالہ اردو زبان میں تصوف کے اعلیٰ خیالات کا حامل تھا۔" (یادگار غالب)

۱۲ر اگست — بادشاہ کو اسہال کی شکایت دور ہوئی۔ مگر کبھی کبھی آجاتے ہیں۔ تپ جاتی رہی۔ گاہ گاہ حرارت ہو آتی ہے۔ قلعہ سے باہر ہوادار پر آتے ہیں۔ مرزا بادشاہ کے غسل صحت کے منتظر ہیں (نادرات غالب خط بنام منشی نبی بخش ص۴۳)

۳ر ستمبر ۱۸۵۳ء — بادشاہ صحت یاب ہو گئے۔ غسل صحت کا دربار ہوا۔ غالب نے مبارکباد کا قصیدہ یا قطعہ پڑھا۔ (نادرات غالب ص۴۴)

۲۹ر ذی قعد ۱۲۶۹ھ — ڈاک گاڑی میں بیٹھ کر کول پہنچے۔ وہاں آٹھ پہر رہے پھر آگے کو روانہ ہوئے (نادرات)

۴ر اکتوبر — (۱) بادشاہ کو ابھی ضعف باقی ہے۔ اور تقریب غسل صحت تھی۔ اس دن دن بھر تابش آفتاب رہی۔ شام

کو بارش ہوئی اس لئے غالب قلعہ نہ جاسکے ۔ (نادرات)

(۲) مرزا نے چنے، گیہوں، بیسن کا بھاؤ بائیس سیر اور گھی دو سیر، سوا دو سیر لکھا ہے ۔ (خط بنام نبی بخش ص۴۸)

نومبر — بادشاہ کے غسل صحت کے منتظر ہیں (خط بنام نبی بخش ص۴۹)

۲۲ر دسمبر۔ پنجشنبہ — غالب کی پھوپھی چل بسیں۔ بقول غالب اس کے مرنے سے تو آدمی مر گئے۔ (خط بنام منشی نبی بخش ص۵ نادرات غالب)

۲۳ر جنوری ۵۴ء دوشنبہ — فارسی مثنوی دفع الباطل لکھ کر بادشاہ کے تبدیل عقائد کے متعلق جو عام شہرت تھی اس کی تردید کی۔ اور اس کی ایک ایک نقل عمائد اہل سنن میں تقسیم کی گئی۔

(حوالہ (۱) نادرات ص۵ (۲) ذکر غالب (۳) آثارِ غالب)

فروری ۵۴ء — دہلی میں چیچک کا زور رہا۔ غالب محفوظ رہے۔

(خط بنام نبی بخش حقیر از نادرات غالب)

اسی زمانہ میں واجد علی شاہ کے دربار سے ۵۰۰ سالانہ وظیفہ مقرر ہوا۔

۲ر مارچ پنجشنبہ — اس ماہ میں مرزا پر احتراق کی شدت رہی اور تپ ولرزہ بھی آٹھ دن تک غذا نہیں کھائی۔

(خط بنام تفتہ خطوط غالب ص۱۹۲)

۲۷ر مارچ دوشنبہ — اس تاریخ کو مرزا نے پانچویں بار مسہل لیا۔
غالب عورتوں کے زیادہ لکھنے پڑھنے کے قائل نہیں۔

محض اتنا کہ وہ قرآن شریف ناظرہ پڑھ لیا کریں۔

مشاعرہ شہر میں کہیں نہیں ہوتا۔ قلعے میں شہزادگانِ تیموریہ جمع ہو کر کچھ غزل خوانی کر لیتے ہیں۔ کبھی اُس محفل میں جاتا ہوں، کبھی نہیں جاتا۔ یہ صحبت خود چند روزہ ہے۔ اس کو دوام کہاں۔ کیا معلوم اب ہی نہ ہو اب کے ہو تو آمین نہ ہو۔

۳ر جون ۵۴ء شنبہ۔ ۸ر رمضان — گرمی کی از حد شدت ہے۔ مرزا میں روزے رکھنے کی طاقت نہیں۔ بے سرو سامانی اور پریشانی کا عالم ہے۔

آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں
سامانِ خور و نوش کہاں سے لاؤں
روزہ میرا ایمان ہے لیکن غالبؔ
خسخانہ و برف آب کہاں سے لاؤں

یہ رباعی مرزا نے بادشاہ کے حضور میں پڑھی۔ بہت ہنسے اور خوش ہوئے اور یہ قطعہ بھی۔

افطار صوم کی جسے کچھ دستگاہ ہو
اُس شخص کو ضرور ہے روزہ رکھا کرے
جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو
روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے

(۲) مرزا احتراق میں مر رہے ہیں۔ ابھی تک دہلی میں

نہیں آئے۔ مرزا کے گھر کے آدمی تپ میں مبتلا ہیں۔

(۲) مرزا ڈاک کے انتظار سے ازحد پریشان تھے۔ لہذا اب بیرنگ خط منگوانے لگ گئے ہیں۔

۱۰ر جون ۱۸۵۴ء — حسین علی ابجد پڑھتا ہے۔ مرزا کو اس کی تعلیم کی ازحد فکر ہے۔

۲۲ر رمضان دوشنبہ

جولائی ۱۸۵۴ء — ان دنوں غالب نے دو غزلیں لکھیں۔

(۱) کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

(۲)

(۳) اسی زمانہ میں ولی عہد سلطنت فتح الملک مرزا محمد سلطان غلام فخر الدین رمز عرف مرزا فخرو ان کے شاگرد ہوئے۔ ان کی سرکار سے چار سو روپیہ سالانہ تنخواہ مقرر ہوئی۔ غالب نے اب کے عید کو قصیدہ نہیں لکھا۔

اگست — مہر نیم روز (جس میں چنگیز خاں سے لے کر تیمور تک کے حالات تھے) تکمیل کو پہنچ گئی۔ تپ کا مرض عام ہوگیا۔ پھر بارشیں شروع رہیں۔ بخار پھیلتا رہا۔ (نادرات غالب)

۳ر ستمبر ۱۸۵۴ء — کو بادشاہ کی خدمت میں پیش ہوئی۔

۱۵ر ۰ — مہر نیم روز مکمل ہو کر شائع بھی ہوگئی۔ مرزا کو شقہ تحسین و

و اظہارِ عنایت عطا ہوا۔ مرزا اسی کو غنیمت سمجھتے تھے۔ مطبع کا نام فخر المطابع تھا۔ قیمت ایک روپیہ تھی۔ (ص ۱۲۰)

۴ر اکتوبر ۱۸۵۴ء — (۱) تپ کی وبا اس مہینہ تک رہی (۲) ڈاک کے نئے بندوبست کے باعث مرزا پریشان ہیں۔ پہلے ڈاک خانہ سے خط کی رسید ملتی تھی۔ اب بیرنگ بھیجے لگ گئے۔ مرزا کو یقین نہیں کہ خط مکتوب الیہ کو مل جائے گا۔ (۳) اسی مہینے کے خط میں مرزا ٹکٹوں کو اسٹامپ کے ٹکڑے لکھتے ہیں۔

۱۶ر اکتوبر — (۱) حسین علی کی بیماری کے باعث جس کو سولہواں دن ہے ازحد پریشان ہیں۔ بیماری کے سبب ازحد کمزور ہوگیا ہے۔

(۲) حسین علی اب اچھا ہے۔ تپ نہیں۔ پیشاب میں ریگ آتی ہے۔

صاحب آثار غالب ذوق کی وفات کی تاریخ ۱۶ر اکتوبر مقرر کرتے ہیں۔

۵ر نومبر ۱۸۵۴ء یکشنبہ — (۱) مرزا۔ عورتوں کے سلسلہ میں حروف شناسی کے قائل ہیں حسین علی اچھا ہے۔ البتہ معدہ پر ورم باقی ہے۔

(۲) زین العابدین کے باپ غلام حسین نے انتقال کیا۔ (یہ غالب کے ہم زلف تھے اور حسین علی کے دادا تھے۔

۱۶ر نومبر — (۱) "میاں ذوق نے انتقال کیا۔ حضورِ والا نے ذوقِ شعر و سخن ترک کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ شخص اپنی وضع کا ایک

اور اس عمر میں عبث تھا۔" (نادرات غالب)

تاریخِ وفاتِ ذوق۔ غالب

با خاطرِ دردمند و مایوس

خون شد دل زار تا نوشتم

خاقانیٔ ہند مرد افسوس

(۲) ذوق کے انتقال کے بعد بادشاہ نے اصلاح لینی شروع کی اگرچہ بادلِ ناخواستہ (یادگار غالب ص۳۲) ۶۹۷

دسمبر ۵۴ء — (۱) مہر نیمروز مطبع فخر المطابع سے طبع ہوئی۔

(۲) "اگرچہ بینائی میری اچھی ہے اور میں عینک کا محتاج نہیں۔ لیکن بایں ہمہ اس کے پڑھنے میں تکلیف کرنا پڑتی ہے۔"

(خط بنام قاضی عبدالجلیل۔ غالب نمبر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ ص۱۶)

۸ مارچ ۱۸۵۵ء پنج شنبہ — اسی سال کے آغاز میں دو رباعیاں لکھیں۔

(۱) کہتے ہیں کہ وہ مردم آزار نہیں

عشاق کی پرسش سے اُسے عار نہیں

جو ہات کہ ظلم سے اٹھایا ہوگا

کیونکر مانوں کہ اس میں تلوار نہیں

(۲)

ہم گرچہ ہوئے سلام کرنے والے

کرتے ہیں درنگ کام کرنے والے

کہتے ہیں کہیں خدا سے اللہ اللہ

وہ آپ ہیں صبح و شام کرنے والے

(خط بنام حقیر ۸ مارچ ۵۵ء)

مئی ۵۵ء — "نو بجا چاہتے ہیں اب قلعہ روانہ ہوتے ہیں۔ مرزا کو گراں گوشی کی شکایت ہوگئی۔

۲۵ مئی۔ ۹ رمضان ۱۲۷۱ھ — حسین علی اچھا ہے اور لم یکن کے سورہ تک پہنچ گیا ہے۔

۱۴ جون — کو زین العابدین عارف کی والدہ نے انتقال کیا۔ لہذا عارف کا بیٹا باقر علی خان مرزا کے پاس آگیا۔ مرزا زیادتی خرچ و ذمہ داری سے از حد پریشان ہیں۔

۲۴ جون۔ ۷ شوال ۱۲۷۱ھ — ابر موجود رہتا ہے۔ غالب کو کچھ تسکین ہے۔ اس عید میں قصیدے کا قصد نہیں کیا۔ نہ قطعہ و رباعی کا۔

(خط بنام نبی بخش ص۷۶)

۵ جولائی پنجشنبہ — "ہوا خوب ہوگئی مینہ روز برستا ہے۔ یکم جولائی سے جھڑی لگ رہی ہے۔ مرزا آجکل موسم کے بدلنے سے خوش ہیں۔ مرزا صاحب قلعہ گئے تھے۔ ۵ کو بارش نہیں ہوئی۔

(بنام نبی بخش ۷۸)

۲۶ جولائی پنجشنبہ — (۱) بارش کی زیادتی ہے شہر میں مکان گر رہے ہیں۔

(۲) آم غالب کو مرغوب ہیں۔ لیکن اس فصل میں انہیں میسر

نہ ہوئے (۲) کے بیٹے کے مرنے کی خبر سن کر از حد پریشان ہیں۔

۴ر اگست چہار شنبہ — باقر علی اور حسین علی دونوں خوش ہیں۔ مرزا صاحب بھی بے فکر ہیں۔

۲۵ر اگست — کی عید الضحیٰ ہوئی۔ مرزا نے مثنوی پیش کی۔ قصیدہ نہ لکھا۔

دولت بشہ دولتِ جاوید باد
تا ابدش عید پس از عید باد

۱۶ر ستمبر ۱۸۵۵ء، ۳ر محرم — مرزا کو نبی بخش حقیر کی خیریت معلوم نہیں ہوئی۔ پریشان ہو کر خط لکھ رہے ہیں۔ (خط بنام نبی بخش حقیر)

۲۴ر ستمبر — مرزا کو زندگی کی فکر نہیں اب موت کی فکر ہے۔ نبی بخش نے پلنگ کے پائے کو لکھا تھا۔ مرزا اس کی تلاش میں ہیں۔

۳ر اکتوبر ۱۸۵۵ء — (۱) رات کو فارسی غزل لکھی۔

اے ذوق نوا سنجی مازم بخروش آور
غوغائے شب خونے بر بنگہ ہوش آور

دانم کہ ز رے داری ہر جا گزرے داری
مے گر ندہد سلطان از بادہ فروش آور

۲۰ر نومبر ۱۸۵۵ء، ۹ر ربیع الاول ۱۲۷۲ھ — "میں نے آئین نامہ نگاری چھوڑ کر مطلب نویسی پر مدار رکھا ہے۔ جب مطلب ضروری التحریر نہ ہو تو کیا لکھوں۔"

(۲) غالب اب قلعے جاتے ہیں تو بہروں چڑھے آتے ہیں۔

(۳) اسی سال نواب محمد یوسف خان والئ رام پور کے تخت نشین ہونے پر مرزا غالب نے قطعۂ تاریخ نواب صاحب کی خدمت میں بھیجا۔ لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔

(ذکرِ غالب ص۸۷۔ غالب از مہر ص۱۴۴)

اسی سال مرزا نے ایک قصیدہ لارڈ الن برا کی خدمت میں ولایت بھیجا کہ وہ ملکہ وکٹوریہ کی خدمت میں پیش کر دیں۔ چنانچہ وہ قصیدہ پیش کر دیا گیا (ذکر غالب ص۹۲)

۱۸۵۶ء — مرزا نے دوبارہ قصیدہ لارڈ کیننگ، گورنر جنرل کے ذریعہ سے ولایت بھیجا۔

(ذکر غالب مالک رام ص۹۲۔ غالب از مہر)

تیسرا قصیدہ واجد علی شاہ کے دربار میں مجتہد العصر سید محمد صاحب کی وساطت سے پیش ہوا۔

۱۱ر فروری ۱۸۵۶ء — واجد علی شاہ کو تخت سے اتار کر کلکتہ بھیج دیا گیا۔ لہٰذا وظیفہ بند ہو گیا (پانچسو روپے سال)

۴ر جون ۱۸۵۶ء — رات کو اچھی خاصی سردی پڑ رہی ہے۔ شہر میں امراض کی شدت نہیں (نادرات غالب ص۸۴)

۱۰ر جولائی — کو مرزا فخرو نے ہیضے سے انتقال کیا (چار سو روپے سالانہ تنخواہ ختم ہوئی)

۲۷ر جولائی — (۱) "ولیعہد کے مرنے سے مجھ پر بڑی مصیبت آئی۔ میرا قدر شناس

مرگیا۔ اب مجھ کو کون پہچانے گا۔ (غالب بنام حقیر)
زین العابدین کے دونوں بیٹوں کو دس روپے مہینہ
ملتے تھے یہ بھی بند ہوئے۔
(۲) مینہ بھی برستا ہے۔ ہوا ٹھنڈی چلتی ہے۔ مرزا خوش
معلوم ہوتے ہیں۔
(۱) نادرات غالب ص۸۵ (۲) داغ نمبر نگار جنوری، فروری

۲ر اگست ۵۶ء — تپ کی شدت ہے، دونوں لڑکوں کو تپ آتی ہے مغلانی
اور خدمتگار غلام حسین بیمار ہیں۔

۵ر اگست — ہوائے وبائی بدستور ہے لوگ مرتے ہیں مگر شدت سے
نہیں۔ ۳، ۴ کو بارش خوب ہوئی۔

اکتوبر ۵۶ء — "میاں۔ کیا باتیں کرتے ہو۔ میں کتابیں کہاں سے چھپواتا۔
روٹی کھانے کو نہیں، شراب پینے کو نہیں، جاڑے آتے
ہیں۔ لحاف، توشک کی فکر ہے۔ کیا چھپواؤں گا"
(ص ۲۷ خطوط مہر)

۱۰ر نومبر ۵۶ء — مرزا نے سید العلماء سید حسین المعروف بہ میرن صاحب برادر
خورد مجتہد العصر سرفراز حسین لکھنو کا قطعہ رحلت کہا ؎
حسین ابن علی آبروئے علم و عمل ✣ کہ سید العلماء نقش خاتمش بودے
نماند و ماندے اگر زندہ پنج سال دگر ✣ عم حسین علی سال خاتمش بودے

۹ر دسمبر ۵۶ء — بیس بائیس دن سے بادشاہ روز دربار کرتے ہیں غالب آٹھ

نو بجے صبح جاتے ہیں بارہ بجے آتے ہیں۔ دوپہر کو کھانا
کھانے میں دیر ہو جاتی ہے۔ دوپہر کے بعد پھر سلیم گڑھ
جاتے ہیں اور چراغ جلے آتے ہیں۔ "رات کو تھک کر
پڑ رہتا ہوں۔ خطوط کے جواب لکھنے کی فرصت نہیں۔"
(نادرات غالب)

جنوری ۵۷ء — (۱) مرزا مسٹر رسل برگ کی طرف سے ملکہ وکٹوریہ کی خدمت
میں درخواست عطائی خلعت و خطاب کے جواب میں
اطلاع ملی کہ بعد تحقیق حکم ہوگا۔ مرزا کو کچھ حوصلہ ہوگیا۔
(غالب از مہر)
(۲) اسی زمانہ میں مولوی فضل حق صاحب کے ایما پر ایک قصیدہ
رام پور ارسال کیا اور قدیمی سلسلہ شاگردی کو دوبارہ زندہ
کرنا چاہا۔ جس کا مطلع یہ ہے۔
ہمانا اگر گوہر جاں فرستم
بہ نواب یوسف علی خاں فرستم

۵ر فروری ۵۷ء — عرضداشت اور قصیدہ پہنچتے ہی نواب یوسف علی خان
نے شاعری میں غالب کی شاگردی اختیار کرلی اور ڈھائی
سو روپے کی رقم شیرینی کے طور پر بھیج دی۔

مئی ۵۷ء — غدر سے چند دن پہلے مرزا نے اپنے دیوان اردو کا ایک
نسخہ لکھوا کر نواب یوسف علی خان کی خدمت میں بھیجا تھا۔
(مکاتیب غالب ص ۳۲، ۳۱)

۱۱رمئی ۵۷ء بروز پیر — جنگِ آزادی شروع ہوگئی اور مرزا خانہ نشین ہوگئے۔ مکان کا دروازہ بند کرکے باہر کی آمدورفت بند کردی۔ لیکن کبھی کبھی قلعہ میں جایا بھی کرتے تھے۔ (ذکرِ غالب ص۹۰)

اس زمانے میں بلی ماران میں رہتے تھے۔ تمام شہر میں فتنہ و فساد کی آگ بھڑک اٹھی۔ بقول غالب چور لوٹ مار سے امیر بن گئے۔ مخمل و ریشم کے بستروں پر استراحت کرنے لگے۔ روشن گھروں میں تیل بھی نہ رہا کہ چراغ جلا سکیں۔ قاصدوں نے خط لیجانے ترک کردیئے۔ سپاہی شاہ و درویش پر حکم چلانے لگے۔ جیل خانہ کے دروازوں کو توڑ کر قیدیوں کو آزاد کردیا۔ حکیم احسن اللہ کے گھر کو آگ لگادی گئی۔

۱۵ر ستمبر — سے شہر کی تمام دوکانیں بند ہوگئیں۔ نہ گندم فروش تھا نہ دھوبی نہ حجام نہ خاکروب۔

۱۸ر ستمبر — دہلی دوبارہ فتح کرلیا گیا۔ مہاراجہ کے سپاہی اس تاریخ سے حکیم محمود خان کے کوچہ پر تعینات کئے گئے۔

۳۰ر ستمبر — ان کے بھائی مرزا یوسف گھر سے نکلے اور گولی کا شکار ہوئے مرزا نمازِ جنازہ تک میں شریک نہ ہوسکے۔

۵ر اکتوبر — کو چند گورے دیوار پھاند کر اس کوچے میں آگئے اور مرزا غالب کو پکڑ کر کرنل براؤن کے پاس لے گئے۔ کرنل نے حالات پوچھ کر سب کو واپس کردیا۔

اسی زمانہ میں مرزا کا سامان اور اثاث البیت زیور جو کالے صاحب کے تہہ خانے میں رکھے ہوئے تھے سب نذرِ غارت ہوا۔ پارچہ پوشیدنی بیچنے کی نوبت آئی۔ مرزا کی پنشن بند ہوگئی۔

۳۰ر اکتوبر — (۱) دہلی کے تحت جو سات جاگیریں تھیں کے والی گرفتار ہوگئے (۲) نواب مصطفیٰ خان شیفتہ۔ منشی صدر الدین آرزدہ، اور مولانا فضل حق گرفتار ہوگئے۔

شنبہ ۵ر دسمبر ۵۷ء — "اپنے مکان میں بیٹھا ہوں۔ دروازے سے باہر نہیں نکل سکتا۔ سوار ہونا اور کہیں جانا تو بڑی بات ہے۔ رہا میرے پاس کوئی آئے، شہر میں ہے کون۔ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں جرنیلی بندوبست (ترجمہ مارشل لا) یازدہم مئی سے آج تک یعنی شنبہ پنجم دسمبر تک بدستور ہے۔"

۲۶ر دسمبر — "بس اتنا ہی کافی ہے کہ اب تک ہم تم جیتے ہیں۔ زیادہ اس سے تم نہ لکھو گے نہ میں لکھوں گا۔ (بزبانی غالب)

جنوری ۵۸ء — ہندوؤں کو آباد ہونے کی اجازت مل گئی۔" جو دم ہے غنیمت ہے اس وقت مع عیال جیتا ہوں۔ بعد گھڑی بھر کے نہ معلوم کیا ہو۔

شنبہ ۳۰ر جنوری ۵۸ء — "دار و گیر سے محفوظ ہوں مئی سے پنشن پایا۔ کہو یہ دس مہینے کیوں کر گزرے ہوں گے انجام کچھ نظر نہیں آتا کہ کیا ہوگا۔

(بنام تفتہ ص۱۲۵ مہر)

۲ / فروری — سپاہیوں کا ایک دستہ پہنچا اور حکیم صاحب کو مع ساٹھ آدمیوں کے پکڑ کرلے گیا۔

چہارشنبہ ۳ / فروری — تفتہ نے سو روپے مرزا کی مدد کی خاطر بھیجے۔

۸ / فروری — "صبر کرو اور چپ رہو۔

بر دل اندہ گیتی بسر آرید۔ گیرید کہ گیتی ہمہ یکسر بسر آرید

اگر جیتے رہے اور ملنا نصیب ہوا تو کہا جائے گا۔ ورنہ قصہ مختصر (اردوئے معلیٰ ص ۲۴۰)

مارچ — (۱) مرزا کے قصائد حکام دہلی نے عتاب آمیز لہجوں میں واپس کر دیئے۔ لارڈ کیننگ کا قصیدہ بھی واپس آگیا۔

(۲) سر جان لارنس نے مسلمانوں کو آباد ہونے کے سرٹیفکیٹ دیئے۔

جمعہ ۱۲ / مارچ — مرزا کی پنشن کے متعلق کیفیت طلب کی جا رہی ہے اور مرزا کی دفتر میں روبکاری (حاضری) ہے۔

۱۲ / اپریل ۵۸ء — (۱) "میں شاعر سخن سنج اب نہیں رہا صرف سخن گو رہ گیا ہوں۔ بوڑھے پہلوان کی طرح پیچ بتانے لگا ہوں۔ بناوٹ نہ سمجھنا۔ شعر کہنا مجھ سے بالکل چھوٹ گیا ہے۔ اگلا کلام دیکھ کر حیران رہ جاتا ہوں کہ میں نے کیوں کر کہا تھا۔"

(۲) مرزا کے اہل و عیال بخیریت ہیں۔ (اردوئے معلیٰ ص ۲۴۱)

دوشنبہ ۲۴ / مئی ۱۸۵۸ء، ۱۰ / شوال ۱۲۷۴ھ — (۱) درد قولنج کا پہلا حملہ ہوا کہ توقع زیست نہ رہی اس کے بعد تھوڑے تھوڑے وقفہ سے آخر تک ہوا (ذکر غالب ص ۱۰۱)

(۲) "بے رزق جینے کا ڈھب آ گیا ہے۔ رمضان کا مہینہ روزے کھا کھا کر کاٹا۔ آئندہ خدا رازق ہے۔ کچھ اور کھانے کو نہ ملا تو غم تو ہے۔" (خطوطِ غالب از مہر ص ۲۶)

۷ / جون ۵۸ء — رئیس بہادر گڑھ کی جاگیر چھن گئی ایک ہزار روپیہ ماہانہ پنشن مقرر ہوئی۔ لاہور بھیج دیئے گئے۔

یکم اگست — (۱) دستنبو (یہ نثر پارسی قدیم میں لکھی گئی۔ جس میں آغاز یازدہم مئی ۵۷ء تا یکم جولائی ۵۸ء کی روئداد ہے۔ یہ بے آمیزش عربی ہے۔ چالیس صفحے پر تمام ہوئی) کا آخری حصہ ختم ہوا۔ جس کے آخری فقرات حسرت آمیز ہیں۔

"کہن بینش اگر بدست آید نیز زنگ از آئینہ نمی زداید و اگر فراجنگ نیامد، بر آبگینہ جز سنگ نیامد۔

(۲) امین الدین و ضیاء الدین کو جاگیر لوہارو واپس مل گئی۔

۱۷ / اگست — (۱) دستنبو چھپوانے کی فکر ہے۔

۲۳ / اگست دوشنبہ ۱۳ / محرم ۷۵ھ — علائی کو خط لکھ رہے ہیں کہ میری بی بی اور بچے تمہاری قوم کے ہیں، مجھ سے لے لو۔ میں اس بار کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ عیال کا قصد لوہارو جانے کا ہے، میرا قصد سیاحت کا۔ پنشن اگر مل گئی اپنے خرچ میں لایا کروں گا۔ جہاں جی لگا وہاں رہ گیا، جہاں سے دل اکھڑا وہاں سے چل دیا۔

(خطوطِ غالب، مہر ص ۵۹)

۱۸۵۸ء — میں غالب نے علاؤالدین احمد علائی کو یہ قطعہ لکھ کر بھیجا جس کے چند شعر یہ بھی ہیں۔

گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے ٭ زہرہ ہوتا ہے آب انسان کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے ٭ گھر بنا ہے نمونہ زندان کا
شہر دہلی کا ذرہ ذرہ خاک ٭ تشنۂ خون ہے ہر مسلمان کا

(خطوط غالب مرتبہ مولانا مہر صـ۵۳)

۱۸ ستمبر — "دستنبو چھپنا شروع ہو گیا یا نہیں"۔ استفسار بنام منشی شیو نرائن۔ مالک مطبع مفید خلائق آگرہ۔

۲۲ ستمبر — غالب نے ملکہ معظمہ کی مدح میں جو ساٹھ شعر کہے ہیں۔ چھ صفحے یعنی تین ورق پر دستنبو سے پہلے شیرازے میں شامل کرنا چاہتے ہیں (نادرات غالب صـ۹۰)

اکتوبر — میں دستنبو (فارسی) پندرہ مہینے کی سرگذشت حالات غدر کے بارے میں شائع کی گئی۔ (ذکر غالب کے خیال کے مطابق نومبر کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوئی۔ صفحوں کی تعداد دس تھی صـ۱۲۲)

اکتوبر — بادشاہ دہلی سے رنگون بھیج دیئے گئے۔

۲۳ اکتوبر — (۱) شیو نرائن مالک مفید خلائق کو جواب دیا کہ بادشاہ کی تصویر مصور سے خریدنے کا تو مجھ میں مقدور نہیں۔ نہ تمہارا نقصان منظور۔
(۲) دریافت کر رہے ہیں "اب چھاپہ تمام ہو گیا ہوگا۔

دستنبو اکتوبر کے آخر میں یا نومبر کے شروع میں چھپ گئی۔

یکم نومبر — "فقیر اس تہی دستی میں کہ اٹھارہ مہینے سے پنشن مقررہ نہیں پایا اپنے مکان پر روشنی کرے گا۔"[1] (غالب از مہر ۲۷۱)

۹ نومبر سہ شنبہ — مالک مکان و کرایہ دار دونوں کو رہنے کا حکم ملا ہے۔ مگر کرایہ سرکار کو دیں۔ (غالب صـ۳۰۲)

فتح دہلی کی مبارکبادی یا ملکہ معظمہ کے سلسلہ اعلانِ معافی میں مرزا صاحب کا قصیدہ شائع ہوا۔

در روزگار ما نتواند کہ یافت
خود روزگار آنچہ دریں روزگار یافت

---

[1] چراغاں کا حکم ہے مرزا نے قطعہ لکھا ہے

دریں روز گا ہمایوں وضع ٭ کہ گوئی بود روزگار چراغاں
شدہ گوش پر نور چوں چشم بینا ٭ ز آوازۂ اشتہار چراغاں
مگر شہر دہلی نے نوراست کا نیچا ٭ نہ گشتہ ہر سو دوچار چراغاں

آخری اشعار ہے

بفرمانِ سر لارنس صاحب ٭ شد ایں شہر آئینہ دار چراغاں
شد از سعی ہنری اجرٹن بہادر ٭ رواں ہر طرف جوئے بار چراغاں
سخن سنج غالب ز روئے عقیدت ٭ دعا می کند در بہار چراغاں
کہ بادا فزوں سال عمر شہنشہ ٭ بروئے زمین از شمار چراغاں

۱۲ نومبر — کتابیں مل گئیں۔

۵ دسمبر — ۵ تاریخ تک بدستور مارشل لا جاری ہے (بزبانی غالب ۲۵۹)

۶ دسمبر — ریڈ صاحب ناظم مدارس ممالک مغربی سے غالب کے کافی مراسم ہیں۔ دستنبو کی ایک جلد ان کو بھیجی ہے۔ وہ بھی ان کے بہت مداح ہیں۔ (ص ۱۵۹ نادرات غالب خطوط غالب بنام تفتہ)

یکشنبہ ۱۹ دسمبر — (۱) خبر اڑ رہی تھی کہ لوگ عموماً شہر میں آباد کئے جائیں گے لیکن ابھی تک کوئی بندوبست نہیں ہوا (غالب از مہر)

(۲) غالب کو انگریزی شراب نہ ملنے کی تکلیف ہے۔ چوبیس روپے درجن سے ساٹھ روپے درجن بھاؤ ہو گیا۔ باہر سے ڈاک کے ذریعہ منگوانا چاہتے ہیں (اردوئے معلیٰ ص ۳۱۵)

۲۸ جنوری ۱۸۵۹ء چہارشنبہ — (۳) غالب نواب مصطفیٰ خاں سے ملنے کے لئے بہ سبیل ڈاک میرٹھ سے واپس آ گئے (اردوئے معلیٰ)

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ قید سے رہا ہو چکے تھے۔ مرزا مبارکباد دینے گئے تھے (خطوط غالب۔ مہر)

۷ جنوری — میں آرنلڈ صاحب کے ازحد شکر گزار ہیں اور منشی نبی بخش کے خط میں ان کے مداح ہیں (اردوئے معلیٰ ص ۳۰۱)

اسی سال غالب نے عینک کا استعمال شروع کیا۔ نواب صدیق حسن خان کی معرفت مرزا غالب نے نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کی رہائی کی کوشش کی اور اس میں کامیاب ہوئے

۱۵ جنوری — آرنلڈ صاحب کو ایک دستنبو اور پنج آہنگ دے کر آئے ہیں (اردوئے معلیٰ ص ۳۰۱)

۲ فروری — (۱) نواب مصطفیٰ حسین بہ میعاد سات برس کے قید ہو گئے تھے سو ان کی تقصیر معاف ہوئی، ان کو رہائی ملی۔ جہانگیر آباد کی زمینداری اور دلی کی املاک اور پنشن کے باب میں ہنوز کچھ حکم نہیں۔ ناچار رہا ہو کر میرٹھ ہی میں ہیں:

(۲) "ہے روز اس شہر میں اک حکم نیا ہوتا ہے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے

(۳) بے ٹکٹ آنے پر حاکم سے پانچ بید لگتے ہیں یا دو روپے جرمانہ کیا جاتا ہے۔ جو لوگ مسلمان شہر میں اقامت چاہے۔ بقدر مقدور نذرانہ دے۔"

مارچ — میں کمشنر دہلی نے بلایا۔ امید بندھی کہ شاید معاملہ سدھر جائے ایک سو روپے بطور امداد ملا۔ خلعت و دربار موقوف رہا۔ (۲) نواب گورنر کی طرف سے دستنبو ملنے کا جواب آیا۔ پچھلے القاب لکھے جانے پر غالب خوش ہیں۔

۱۹ اپریل — غالب دستنبو کے پنجاب میں بکنے کے ازحد ممنون ہیں۔

(۲) غالب کی غزلیں ۹ بیت سے کم اور زیادہ سے زیادہ تین ہوتی ہیں (اردوئے معلیٰ ص ۳۰۲)

۲۶ اپریل چہارشنبہ — غالب کا دل نہ ریختہ لکھنے کو چاہتا ہے نہ فارسی اشعار کہنے

کو۔ دو سال میں صرف دو قصیدے لکھے ہیں (اردوئے معلّیٰ ص ۳۰۳)

۵ جون — نبی بخش کا خط نہ آنے کے سبب از حد پریشان ہیں۔

۱۲ جون — شیو نرائن سے اخبار معیار الشعراء منگانا چاہتے ہیں۔

جولائی ۵۹ء — (۱) نواب یوسف علی خاں کی خدمت میں قصیدہ بھیجا جسکے چند اشعار یہ ہیں۔

چون نیست مرا شربت آبے ز تو حاصل
دانم کہ تو دریائے و من سبزہ ساحل
در بار بہ ہر گونہ غریبان ز چہ سوزد
آں شمع فروزاں کہ بود در خور محفل
آں خسرو خوباں چہ قدر چشم وفا بود
صد حیف کہ سر نقش امیدم ہمہ باطل

(۲) اسی مہینے میں نواب یوسف علی خاں نے ۱۰۰ روپے ماہوار کر دیا لیکن اگر رامپور آئیں تو ۲۰۰ روپے ماہوار ملیں گے۔

(مکتوب غالب، عرشی دغالب از مہر خطوط غالب بنام تفتہ ص ۱۸۲)

نواب صاحب کی طرف سے اکثر و بیشتر مرتبہ ۲۵۰ روپے ملتے رہے جو ماہانہ رقوم کے علاوہ تھے۔

(۳) اسی مہینے میں غالب کے پاس رسالہ بغاوت ہند پہنچا۔

(۲۳ جولائی) اردوئے معلّیٰ ۳۰۵)

۷ اگست چہارشنبہ — غالب معیار الشعراء، بغاوت ہند نہ پہنچنے کی شکایت کرتے ہیں۔

۲۲ ستمبر ۵۹ء — معیار الشعراء کا پارسل پہنچ گیا ہے۔

شنبہ ۵ نومبر — "نہ جزا، نہ سزا، نہ نفرین، نہ آفرین، نہ عدل نہ ظلم، نہ قہر پندرہ دن پہلے تک دن کو روٹی، رات کو شراب ملتی تھی اب صرف روٹی ملے جاتی ہے، شراب نہیں۔ کپڑا ایام تنعم کا ہوا بھی ہے اس کی فکر کچھ نہیں ہے۔"

(بنام تفتہ خط نمبر ۴۷، صفحہ ۱۷۹)

دسمبر ۵۹ء — دہلی کے مسلمانوں پر تعزیری ٹیکس عائد ہوا۔

(۲) حکیم احسن اللہ خاں کے مکانات شہر ان کو مل گئے۔ حکم ہے شہر سے باہر نہ جاؤ۔ نواب حامد علی خان کے سب مکانات ضبط۔ کرایہ کے مکان میں رہتے ہیں۔

(۳) اس زمانے میں نواب نے رامپور سے لکھا کہ گورنمنٹ سے آپ کی سفارش کی گئی ہے امید ہے کہ مدارج شریف جو قدیم سے حاصل ہیں آپکو مل جائیں گے۔

۲ دسمبر ۵۹ء — (۱) "دہلی شہر کی ہستی کتنی ہنگاموں پر تھی۔ قلعہ، چاندنی چوک، ہر روز مجمع جامع مسجد کا، ہر ہفتے سیر جمنا کے پل کی، ہر سال میلہ پھول والوں کا۔ یہ پانچوں باتیں اب نہیں، پھر کہو دلی کہاں؟ ہاں کوئی شہر قلمرو ہند میں اس نام کا تھا۔"

(۲) اہل اسلام میں سے صرف تین آدمی باقی ہیں۔ میرٹھ میں مصطفیٰ خاں۔ سلطان جی میں مولوی صدر الدین، بلی ماروں

میں سگِ دنیا موسوم بہ اسد۔ تینوں مردود و محروم و مغموم۔

توڑ بیٹھے جب کہ ہم جام و سبو پھر ہم کو کیا
آسمان سے بادۂ گلفام گو برسا کرے

۷؍دسمبر — غالب سکریٹری سے ملنے کے لئے گئے وہ نہیں ملے اور کہا "تم غدر میں باغیوں کی خوشامد کرتے رہتے تھے۔" نہ دربار، نہ پنشن نہ خلعت۔

۲۹؍دسمبر — لارڈ صاحب کا لشکر بدستور دہلی میں ہے (اردوئے معلیٰ ص ۲۸۵)

۳۱؍دسمبر شنبہ — غالب آرزوئے مرگ رکھتے ہیں اس لئے کہ سکون میں زندگی تو بسر نہیں ہوتی (اردوئے معلیٰ ۲۷۲)

بنام نواب حسین مرزا۔ "مکانات کو حامد علی خاں کا کہہ کر کیوں لکھتے ہو، وہ مدت سے ضبط ہو کر سرکار کا مال ہو گیا۔ باغ کی صورت بدل گئی۔ محل سرا اور کوٹھی میں گورے رہتے ہیں، اب پھاٹک اور سراسر دوکانیں گرا دی گئیں۔ سنگ و خشت کا نیلام کر کے روپیہ داخل خزانہ ہوا۔ مگر یہ نہ سمجھو کہ حامد علی خاں عالی کے مکان کا ملبہ بکا ہے۔ سرکار نے اپنا مملوکہ و مقبوضہ ایک مکان ڈھا دیا۔ جب بادشاہ اودھ کی املاک کا وہ حال ہو تو رعیت کی املاک کو کون پوچھتا ہے۔"

جنوری ۱۸۶۶ء — مرزا صاحب دہلی سے ۱۹؍جنوری کو رام پور روانہ ہوئے۔ مارچ کے آخر میں واپس دہلی آئے۔ (بنام تفتہ)

بیماریوں نے پھر شدت سے حملہ شروع کیا (خط بنام مجروح غالب نمبر ۳۹)

فروری ۱۸۶۶ء — "غالب رام پور میں ہیں لکھتے ہیں: "یہ رام پور ہے جو لطف یہاں ہے وہ اور کہاں ہے۔ پانی سبحان اللہ۔ شہر سے تین سو قدم پر ایک دریا ہے اور کوسی اس کا نام ہے۔ بے شبہ چشمۂ آب حیات کی کوئی سوت اس میں ملی ہے۔ خیر۔ اگر یوں بھی ہے تو آب حیات عمر بڑھاتا ہے لیکن اتنا شیریں کہاں ہوگا۔"

(ص ۲۸۷۔ خطوط مہر)

مارچ — میں گورنر جنرل نے کمشنر دہلی کو خلعت کے سلسلہ میں سفارش کرنے کے متعلق لکھا تھا (اس امر میں نواب یوسف علی خان اور سر سید کی کوششوں کو خاص دخل تھا)

۶؍اپریل جمعہ — "میر مہدی تم میرے حالات بھول گئے۔ ماہ رمضان المبارک میں کبھی مسجد جامع کی تراویح ناغہ ہوئی ہے۔ میں اس مہینے رامپور کیوں رہتا۔ نواب صاحب مانع رہے۔ منع کرتے رہے۔ برسات کے آموں کا لالچ دیتے رہے۔ میں اس انداز سے چلا کر چاند رات کے دن یہاں آ پہنچا۔ یکشنبہ کو غرۂ ماہ مقدس رہا۔ اسی دن سے ہر صبح نواب حامد علی خاں کی مسجد میں جا کر جناب مولوی جعفر علی صاحب سے قرآن سنتا ہوں۔ شب کو جامع مسجد میں جا کر تراویح پڑھتا ہوں۔"

۶؍مئی شنبہ — پنشن کا یکمشت دو ہزار پچاس روپیہ تین سال کا ملا۔

(ذکر غالب ص۹۴ ۔ غالب از مہر ص۳۱۵)

دو شنبہ ۲ر جولائی "عاشقانہ اشعار سے مجھ کو وہ بُعد ہے جو ایمان سے کفر کو۔

بنام علاء الدین احمد (خطوط غالب از مہر ص۵۶)

۸ ذی الحجہ ۷۶ھ ۸ر جولائی پنشن بے کم و کاست جاری ہوا۔ زر مجتمع سہ سالہ مل گیا۔ غالب بلیماروں میں منتقل ہو گئے (غالب از مہر ص۵۷)

۸ر جولائی (۱) کو کلام کا تیسرا ایڈیشن مطبع احمدی شاہدرہ سے شائع ہوا۔

(نادرات غالب و ذکر غالب)

(۲) خلعت و دربار بحال ہو گیا۔ سر سید نے بھی خاص کوشش کی تھی۔ (ذکر غالب ص۹۴)

(۳) قاطع برہان تحریر کی جس میں برہان قاطع کی غلطیوں کا ذکر تھا۔

(۴) مرزا کے اردو خطوط چودھری عبد الغفور مارہروی اور خواجہ غلام غوث بیخبر نے جمع کرنے شروع کئے۔

(۵) مرزا کے فاضل دوست مفتی صدر الدین نے قید سے رہائی حاصل کی۔ نصف جائداد واگزار ہوئی۔

۱۹ر نومبر (دو شنبہ) ۸ر جمادی الاولیٰ مرزا نے منشی نبی بخش کا قطعہ تاریخ رحلت لکھ کر بھیجا ؎

شیخ نبی بخش کہ با حسنِ خلق ۔ داشت مذاقِ سخن و فہم تیز

سال وفاتش ز پے یادگار ۔ با دلِ زار و مژۂ دجلہ ریز

خواستم از غالب آشفتہ سر ۔ گفت مدہ طول دگو رستخیز"

۱۸ر دسمبر سنہ ۱۸۶۰ء "اے میر مہدی تو درماندہ و عاجز پانی پت میں پڑا رہے۔ میرن صاحب

وہاں پڑے رہے۔ دلّی کو ترسا کریں۔ سرفراز حسین لو کری ڈھونڈھا پھرے، اور میں ان غم ہائے جانگداز کی تاب لاؤں۔ مقدور ہوتا تو دکھا دیتا کہ میں نے کیا کیا۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ"

۹ر جنوری سنہ ۱۸۶۱ء پنشن سب کو سراسر ششماہی ملنے کا حکم ہو گیا ہے۔ ہر مہینے میں سود دی لو اور کھاؤ۔

(۲) چار دن سے پُروا ہوا چلتی ہے۔ ابر آتے ہیں مگر صاف چھڑکاؤ ہوتا ہے۔ مینہ نہیں برستا۔ اناج گراں ہے۔

(۳) والی ٹونک اور مختار الملک کو حیدر آباد قصیدے بھیجے۔ قصیدہ کا انداز، سلاستِ زبان اور بلاغتِ کلام کے اعتبار سے جس قدر گہرا ہے وہ غالب کی بلندیٔ تخیل کو ظاہر کر رہا ہے۔

در نظم بلند پایہ رندم ۔ والائے خاندان نگویم

عشق است ظہیر و انوری را ۔ از سنجر و ارسلان نگویم

کس نیست متاع را خریدار ۔ یا آنکہ بہا گران نگویم

نگم ز سوال نیست اما ۔ با کلک بہ زبان نگویم

نواب میر غلام بابا نے سورت آنے کی دعوت دی مگر بیماریوں کے باعث نہ جا سکے۔ اور رام پور بھی نہ جا سکے۔

(ذکر غالب ص۱۰۱)

غالب نے قاطع برہان شائع کیا۔

غالب بہت کمزور ہو گئے (ذکر غالب ص۱۰۲)

۴ر اپریل ۶۱ء (پنجشنبہ) — (۱) غالب کو گمان ہے کہ اُن کا ممدوح جیتا نہیں۔ نصیر الدین حیدر، امجد علی شاہ ایک ایک قصیدے میں چل دیئے۔ واجد علی شاہ تین قصیدوں کے متحمل ہوئے پھر سنبھل نہ سکے۔ جس کی مدح میں دس بیس قصیدے کہے گئے وہ عدم سے بھی پرے پہنچا۔ اس لئے وہ نہ علاء الدین کے لڑکے کی تاریخ ولادت کہتے ہیں نہ نام تاریخی ڈھونڈھتے ہیں۔ (خطوط غالب از مہر ص۵۹)

(۲) علائی نے غالب سے محلے کا پتہ پوچھا اس سے میرزا کے احساسِ شہرت و عظمت کو ٹھیس لگی۔ نہایت دلچسپ انداز میں اظہار کیا "آپ صرف دہلی لکھ کر میرا نام لکھ دیا کیجیے۔ خط پہنچنے کا میں ضامن"

مئی ۶۱ء — علاء الدین کو مختلف تخلص تجویز کرکے بھیجتے ہیں۔

یکم جون ۶۱ء (شنبہ) ذی الحجہ ۱۲۷۷ھ — غالب بعض لغات کے اعراب دیکھنے کے لئے فرہنگ منگاتے ہیں۔ بنام علاء الدین خط نمبر ۸ (ص۶۱ تا ص۶۲)

اسی مہینے میں دو فارسی غزلیں، دو اردو غزلیں اپنے حافظ کی تحویل سے بھیجتے ہیں۔ فارسی غزلوں کا مقطع یہ ہے۔

(۱) غالب بہ چنیں کشاکش اندر
یا حضرت بوتراب تا کے

(۲) لالہ و گل و مد از طرف مزارش پس مرگ
تا چہا در دل غالب ہوس روئے تو بود

(مطبوعہ سید حسین)

اردو غزلوں کے مقطعے ؎

(۱) ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

(۲) غالب تمہیں کہو کہ ملے گا جواب کیا
مانا کہ تم کہا کئے اور وہ سنا کئے

جون سے قبل ہی قاطع بُرہان، برہان قاطع کے رد میں چھپ چکی تھی۔ قاطع برہان کی اشاعت کے بعد ایک نیا ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ (۱۳۱ غالب نمبر مسلم یونیورسٹی)

جون ۱۸۶۱ء — میں مطبع نظامی کانپور سے چوتھا ایڈیشن شائع کیا گیا۔ (ذکر غالب ص۱۳۳)

جولائی ۱۸۶۱ء — جان محمد قدسی نے ایک زمین میں غزل کہی تھی جس کا ایک شعر یہ ہے ؎

در بزم وصال تو بہ ہنگام تماشا
نظارہ ز جنبیدن مژگان گلہ دارد

غالب سے اس پر لکھنے کی فرمائش کی گئی۔ غالب نے لکھا یہ زمین قدسی علیہ الرحمۃ کے حصہ میں آ گئی ہے میں اس میں کیونکر تخم ریزی کروں۔ بے حیائی سے کچھ ہاتھ ہلاؤں تو اس کا جواب کہاں سے لاؤں۔ پھر ایک شعر اسی زمین میں لکھا ؎

ہرگز نتواں گفت دریں قافیہ اشعار
بے جاست برادر اگر از تو گلہ دارد

بادشاہ ظفر شاہ چل بسے (ذکر غالب)

غالب کو مرض کی شکایت پیدا ہو گئی۔ (ص ۱۰۱)

۱۹ر اگست ۶۱ء دوشنبہ — مرزا صاحب کو نصیر الدین کی تعریف میں قصیدہ لکھنا پڑا۔ پانچ ہزار روپے انعام کا حکم ملا۔ تین ہزار روشن الدولہ کھا گئے اور دو ہزار منشی محمد حسن نے اُڑا لئے۔ ناسخ نے غالب سے تحریر تو منگوائی کہ دربار میں سنا کر اُن کو رسوا کریں۔ لیکن خط لکھنے کے تیسرے ہی دن نصیر الدین حیدر کے مرنے کی خبر اڑ گئی۔ اب ناسخ و غالب کیا کریں۔ (بنام تفتہ خط نمبر ۸۰)

۲۵ر ستمبر ۶۱ء چہارشنبہ — غالب اب خود کو معدوم محض سمجھتے ہیں۔ نہ لوہارو جانے کے قابل سمجھتے ہیں نہ رام پور۔ تڑپ رہے ہیں لیکن دو برس سے رام پور بھی نہ جا سکے۔ نواب پور کو لکھ دیا کہ "تمہارا اقبال تمہارے کلام کو اصلاح دیتا ہے۔ اس سے بڑھ کر مجھ سے خدمت نہ چاہو۔"

اکتوبر ۶۱ء سہ شنبہ — علائی کے نام خط میں بیکانیر کی مصری کے ٹکڑے کو یاد کرتے ہیں (بنام ہرگوپال تفتہ)

۴ر اکتوبر جمعہ — "برہان قاطع کا خاکہ اڑا رہا ہوں۔ بہت سے اغلاط نکالے ہیں۔ دس جزو کا ایک رسالہ لکھا ہے اس کا نام قاطع برہان رکھا ہے۔ چھاپے کی فکر ہے۔"

۱۲ر نومبر ۶۱ء سہ شنبہ چاشتگاہ — مرزا نے اپنے خط میں (ہمراہ دے گیا) کے لئے "لوا کر دے گیا" استعمال کیا۔ یہ ترکیب آج بھی دہلی اور مراد آباد کے اطراف میں

بولی جاتی ہے۔

۱۵ر شعبان ۷۸ھ — غالب نے سفارش کی املا "سپارش" سے لکھی

۱۶ر فروری ۶۲ء یکشنبہ — مرزا نے دہلی کے نامور اور رؤسا کی تباہی کا حال تفصیلاً بیان کیا۔ (خطوط غالب ص ۵۲) از مہر

یکم مارچ ۶۳ء — غالب نے انگریزی لفظ ایگریمنٹ کا استعمال اپنے خط میں کیا۔

۲ر مارچ — غالب مولوی اظہار حسین خاں سے ملنے گئے انہوں نے کہا "تمہارا دربار خلعت بدستور بحال و قرار۔ (آثارِ غالب ص ۱۴۸)

۵ر رمضان۔ ۷ر مارچ — غالب اب اطمینان کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور دل میں کسی قسم کا وسوسہ پیدا نہیں ہے "لا موجود الا اللہ کے بادۂ ناب کا محل گراں چڑھائے ہوئے اور کفر و اسلام و نور و زنار کو ملائے ہوئے بیٹھے ہیں ؎

کجا غیر و کو غیر و کو نقشِ غیر :: سوائے اللہ واللہ مافی الموجود

۲۳ر مارچ ۶۳ء — گورنر پنجاب نے بلا کر خلعت عنایت کیا۔ سر سید کی کوششوں کو کافی دخل تھا۔ (آثار غالب ص ۱۴۸)

۲۷ر مارچ — غالب کو پھوڑوں پھنسیوں سے سخت "تکلیف ہے۔" ص ۱۴۱ مہر

۳ر مئی — بنام منشی شیو نرائن۔ "غالب خلعت کے ملنے اور پنشن کھلنے پر از حد خوش ہیں البتہ پھوڑوں کے نکلنے کے سبب پریشان ہیں" کلیات نظم فارسی ایڈیشن نولکشور کے ہاں چھپا۔ جس میں

۴۲۴، ۱۰ شعر ہیں۔ قیمت پانچ روپے مقرر کی گئی تھی (ذکر غالب ص ۱۲۶)

۳ جولائی سنہ ۶۳ء
بائیں پاؤں میں مہینے بھر سے ورم ہے۔ کھڑے ہونے میں رگیں پھٹنے لگتی ہیں۔ افعالِ دماغ ناقص ہو گئے۔ حافظہ گویا تھا ہی نہیں۔ (خط نمبر ۹۹۔ غالب از مہر)

مرزا نے عارف کے دونوں بچوں باقر علی اور حسین علی کی تعلیم کے لئے آٹھ صفحے کا مختصر رسالہ قادر نامہ تصنیف کیا۔ جسمیں اردو فارسی لغات میں اشعار کی تعداد ۱۲۷ ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۸۶۴ء میں دہلی سے نکلا۔

(۲) لطائف غیبی ۴۱ صفحہ کا رسالہ مطبع اکمل المطابع سے شائع ہوا۔ یہ سعادت علی کے محرق قاطع برہان کے جواب میں تھا یہ سیاح دادخان کے نام سے چھپا تھا مگر اصل میں غالب نے لکھا تھا۔

(۳) سوالات عبدالکریم (اردو کا ۸ صفحہ کا رسالہ) بجواب سعادت علی محرق قاطع برہان کے جواب میں نکلا۔ اس تصنیف میں غالب کا سب سے بڑا ہاتھ تھا (ذکر غالب ص ۱۴۲)

۱۵ فروری سنہ ۶۴ء
۷ رمضان دوشنبہ
غالب کے پاس مولوی عبدالغفور ڈپٹی کلکٹر کلکتہ نے اپنا دیوان "دفتر بے مثال" بھیجا۔

سال گذشتہ مجھ پر سخت گزرا۔ بارہ تیرہ مہینے صاحب فراش رہا۔ یعنی احتراق کا مرض۔ سر سے پاؤں تک بارہ پھوڑے

ہر پھوڑا ایک زخم، ہر زخم ایک غار۔ اب تندرست ہوں۔ ناتواں و سست ہوں۔ حواس کھو بیٹھا، حافظہ کو رو بیٹھا۔ اگر اٹھتا ہوں تو اتنی دیر میں جتنی دیر میں ایک قدِ آدم دیوار اٹھے۔ (صفحہ ۳۶۹ خطوط مہر)

جون سنہ ۶۴ء
"قبلہ ایک سو بیس آم پہنچے۔ خدا حضرت کو سلامت رکھے۔ میں مریض نہیں ہوں بوڑھا ہوں۔ ناتواں گویا نیم جاں۔ ایک کم سو برس دنیا میں رہا۔ کوئی کام دنیا کا کیا نہ دین کا۔"

۱۱ جولائی سنہ ۶۴ء
دوشنبہ
۶ صفر سنہ ۱۲۸۱ھ
غالب اپنے سلسلہ میں تو خدا سے بھی (معاذاللہ) مایوس ہیں۔ میں تو اپنے باب میں خدا سے نا اُمید ہو کر کافرِ مطلق ہو گیا ہوں موافق عقیدۂ اہلِ اسلام جب کافر ہو گیا تو مغفرت کی بھی توقع نہیں رہی۔ چل بھئی نہ دنیا نہ دین۔ مگر تم حتی الوسع مسلمان بنے رہو۔ خدا سے نا اُمید نہ ہو۔ اِنَّ مَعَ العُسرِ یُسرًا کو اپنا نصب العین رکھو (بنام مرزا قربان بیگ ص ۱۱۲ خطوط غالب از مہر)

اپریل سنہ ۱۸۶۵ء
(۱) میں نواب یوسف علی خان چل بسے۔ نواب کلب علی خان تخت نشین ہوئے۔ مرزا نے تہنیت نامہ کے ساتھ قصیدہ بھیجا۔ جس میں اپنی کمزوریوں اور ضعفِ پیری کے سبب حاضر ہونے سے معذوری کا اظہار کیا۔

نظر بخستگی و پیری و تہیدستی
قبول کردن تنظیم من خوش است آرزو

ان تمام قصائد میں عربی کا رنگ خاص طور سے غالب رہا۔
جس سے رفعتِ تخیل، بلندیٔ نظر اور قدرت زبان کا
بہترین ثبوت ملتا ہے۔

(۲) نواب لیفٹنٹ گورنر جدید نے دربار کیا۔ میری تعظیم
اور مجھ پر عنایت کی۔"

شنبہ ۱۷ر جولائی ۶۵ء / ۱۰ر شعبان ۱۲۸۱ھ — "کیا کہوں کیا حال ہے۔ پیش ازیں اپنا یہ شعر پڑھا کرتا تھا۔

بس ہجوم ناامیدی خاک میں مل جائے گی
یہ جو اک لذت ہماری سعیٔ بے حاصل میں ہے

اب اس زمزمے کا بھی محل نہ رہا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اگست سنہ ۶۵ء — غالب دہلی سوسائٹی کے جلسے میں شریک ہوئے۔
(ص ۵۷ غالب نمبر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

۱۷ر ستمبر ۶۵ء یکشنبہ — نواب میر غلام بابا خان کے خط میں جو عزت افزائی کی غالب
اس کے لئے منت پذیر ہیں۔

۱۱ر اکتوبر — میں جشن میں شرکت کے لئے رامپور گئے (ذکر غالب ص ۹۵)

۲۱ر اکتوبر — "جشن یکم دسمبر سے شروع ہوگا" نواب صاحب کا اخلاص و
التفات روز افزوں ہے۔"

۷ر نومبر — کو مبلغ ایک ہزار روپیہ ملا۔ گویا نواب کلب علی خان نے
گذشتہ روایات کو قائم رکھا۔ دستنبو کا دوسرا ایڈیشن
شائع ہوا۔

۵ر دسمبر سنہ ۶۵ء — قاطع کا جزوِ ثانی درفش کاویانی کے نام سے شائع کیا گیا۔
(ذکر غالب ص ۱۲۵)

سنہ ۱۸۶۶ء — (۱) تیری وصد عیب[۲] مرزا کے رشتہ دار کے بھتیجے نے بوستانِ
خیال کا ترجمہ کیا۔ مرزا نے دو ورقہ دیباچہ لکھا۔ ایک
دوسرے خط میں نواب میر غلام بابا کو اس کتاب کی خریداری
کے لئے متوجہ کرتے ہیں (ص ۲۱۵ خط نمبر ۵۔ خطوط مہر)

(۳) اسی سال نواب کلب علی خان سے کچھ تعلقات کشیدہ
ہو گئے۔ مرزا نے معذرت نامے کے قطعات بھی روانہ کئے
(ذکر غالب ص ۹۶)

البتہ ماہوار مشاہرہ جاری رہا اور خاص خاص موقعوں پر
عطیات بھی۔

(۴) اسی سال انہوں نے جو غزل کہی وہ آخری ہے۔

مئی سنہ ۱۸۶۶ء — ہاتھوں میں رعشہ وضعف ہے، جہاں چار سطریں لکھیں انگلیاں
ٹیڑھی ہو گئیں حرف سوجھنے سے رہ گئے (از مہر)

۱۷ر جون سنہ ۶۶ء — سیاح کو سورت سے آم بھیجنے کو منع کرتے ہیں۔ روپے
کے آم، چار روپے کے محصول ڈاک۔ آم برابر مرزا صاحب
کے دوستوں سے پہنچ رہے ہیں۔ دہلی میں آگ برس رہی ہے
لو چل رہی ہے۔ (خطوط غالب از مہر)

۲۶ر اگست سنہ ۶۶ء — مولوی غلام غوث میر منشی نے غالب کا مجموعۂ نثر مرتب کرکے

منشی ممتاز علی خاں کو بھیج دیا (رہ عود ہندی کے نام سے چھپا)

۱۴ر دسمبر ۶۶ء
۲۵ر رجب ۱۲۸۳ھ
ایک سو باسٹھ روپے آٹھ آنے کی آمد، تین سو کا خرچ ہر مہینے میں ایک سو چالیس کا گھاٹا۔ کہو زندگی دشوار ہے یا نہیں۔ (صفحہ ۴۶۲ از مہر)

جنوری ۶۷ء
غالب ٹوپیاں بذریعہ پارسل سیاح کو بھیجتے ہیں۔

۱۱ر جنوری
(۲) منشی حبیب اللہ کے نام دوسرے خط میں موید برہان مولوی احمد علی مدرس مدرسہ کلکتہ نے لکھا۔ غالب نے جواب میں قطعہ لکھا۔ اور وہ ان کو بھیج رہے ہیں۔

فروری ۶۷ء
غالب نے سیاح کو سیف الحق کا خطاب دیا ہے کہ غالب سیاح کو اپنے عزیز کے اخبار اشرف الاخبار کی خریداری پر توجہ دلاتے ہیں۔

مارچ ۶۷ء
(۱) نواب میر غلام بابا خان نے عدالتِ عالیہ میں فتح پائی غالب نے قطعۂ تاریخ کہا سے

فتح سید غلام بابا خاں ؛ خود نشانِ دوام اقبال است
ہم ازیں ادلود کہ غالب گفت ؛ کہ "ظفر نامۂ ابد" سال است

(۲) منشی حبیب اللہ کو لکھ رہے ہیں "موید برہان" مل گئی تم اس کا جواب لکھو۔

۱۶ر اپریل ۶۷ء
چہارشنبہ
غالب کی طاقت سلب ہو گئی۔ ہاتھ میں رعشہ، بینائی ضعیف۔ نوکر رکھنے کا مقدور نہیں۔ اب دوست سے

خط لکھواتے ہیں۔ منشی میاں داد خاں سیاح کی محبت اور ان کے توسط سے نواب صاحب کی محبت دل و جان میں سما گئی ہے۔ اس طرح جیسے اہلِ ایمان میں ملکۂ ایمان کا۔ (خطوط غالب از مہر ص ۴۱۸)

۲۳ر اپریل ۶۷ء
نواب غلام بابا خاں نے سیاح کے ذریعہ غالب کو سو روپے بھجوائے۔ غالب شکریہ کا خط لکھتے ہیں۔

جون ۶۷ء
بنام منشی سیاح صاحب "اشعار کی اصلاح کیوں کر دوں اس موسم میں گرمی سے بھیجا پگھلا جاتا ہے۔ دھوپ کو دیکھنے کی تاب نہیں۔ رات کو صحن میں سوتا ہوں۔ صبح کو دو آدمی ہاتھوں میں لے کر دالان میں لے آتے ہیں ایک کوٹھری ہے اندھیری اس میں ڈال دیتے ہیں۔ تمام دن اس گوشۂ تاریک میں پڑا رہتا ہوں۔ شام کو پھر دو آدمی بدستور لیجا کر صحن میں پلنگ پر ڈال دیتے ہیں۔ غالب مرگِ ناگاہ کے طالب ہیں۔

(۲) مرزا کی تصویر ابھی مکمل نہیں ہوئی۔ پانچ مہینے سے مصور نے کام ختم نہیں کیا۔

۲۵ر اگست ۶۷ء
(۱) بھائی میں کوئی دن کا مہمان ہوں۔
(۲) غالب نے اپنا حال اکمل الاخبار میں چھپوا دیا ہے۔ حاجتی کی حاجت بہ سبب سرعت یوں گھنٹہ بھر میں پانچ

چھ مرتبہ ہوتی ہے۔

۲۵؍ جنوری ۶۸ء — سیاح کی طرف سے تصویر کا تقاضہ بدستور ہے اور غالب مصور سے عاجز ہیں۔ وعدہ ہی وعدہ ہے وفا کا نام نہیں۔ غالب کے پاس کلیات میر تقی میر کا انتخاب میر فخر الدین نے بھیج دیا۔

۲۷؍ جنوری ۶۸ء — "غذا پہلے تولوں پر منحصر تھی، اب ماشوں پر ہے۔ زندگی کی توقع آگے مہینوں پر تھی، اب دلوں پر ہے۔ اس میں مبالغہ نہیں۔ میرا یہی حال ہے۔"

۲۶؍ فروری ۶۸ء — غالب بہاری لال مشتاق کو ان کے والد کے انتقال پر تلقین صبر دے رہے ہیں۔

دوشنبہ ۱۱؍ اپریل ۶۸ء — غالب گرمی کو آتشِ دوزخ سے تشبیہ دے رہے ہیں۔ "اب آتشِ دوزخ نے رہا سہا جلا دیا۔"

۷؍ جون ۶۸ء — غالب بہاری لال مشتاق کو ان کی املا کی غلطیوں کی طرف متوجہ کرتے ہیں اور ان کو حکیم غلام رضا خان کی دوام صحبت کے شرف حاصل رکھنے کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔

۲۱؍ جون ۶۸ء یکشنبہ صفر ۱۲۸۵ھ — مرزا علاءالدین کو دبستان فارسی کا جانشین اور خلیفہ مقرر کیا۔ غالب کی عمر ۷۰ سال کی ہو چکی ہے۔

۳؍ جولائی ۶۸ء — "نیم جاں ہوں، غلط نہیں لکھ سکتا۔ ایک لڑکے سے یہ چند سطریں لکھوا دی ہیں۔ میں جو کہتا گیا، وہ غریب لکھتا گیا۔ آپ سید ہیں اور بزرگ ہیں۔ میرے حق میں دعا کریں کہ اب

چھتر برس سے آگے نہ بڑھوں۔ اور اگر زندگی کچھ اور ہے تو حق صحت عنایت کرے تاکہ دوستوں کی خدمت بجا لاؤں۔"

۱۷؍ اگست ۶۸ء — غالب نے اپنی تصویر منشی میاں داد خاں کی معرفت نواب ابراہیم علی خاں وفا کی نذر کی۔

۵؍ دسمبر ۶۸ء — "بھائی اب میری انگلیاں نکمی ہو گئی ہیں۔ بصارت میں بھی ضعف آگیا ہے دو سطریں نہیں لکھ سکتا۔ اطراف و جوانب سے خطوط آئے دھرے رہتے ہیں۔ جب کوئی دوست آجاتا ہے میں اس سے جواب لکھواتا ہوں۔"

(بنام میرزا باقر علی کامل۔ صفحہ ۱۱۴۔ خطوط از مہر)۔

۷؍ دسمبر ۶۸ء — غالب مہاراجہ الور کے نظرِ التفات کے منتظر ہیں۔ اور مرزا باقر علی کامل کو لکھتے ہیں کہ "کبھی دربار میں میرا بھی کچھ تذکرہ آتا ہے یا نہیں۔ اگر آتا ہے تو کس طرح آتا ہے؟ حضور سن کر کیا فرماتے ہیں۔؟"

۱۵؍ فروری ۱۸۶۹ء کو مرزا نے اس دارِ فانی سے کوچ کیا۔ آہ غالب بمرد۔

غالب کے بعد

۶؍ مارچ کو اردوئے معلیٰ (خطوط کا دوسرا مجموعہ) شائع ہوا۔

۱۸۷۰ء — بیگم غالب بھی چل بسیں۔

۱۸۷۱ء — دستنبو کا تیسرا ایڈیشن شائع ہوا۔

(ذکر غالب ص ۱۲۳)

اخبار رفیقِ ہند

انیسویں صدی کا آخری قرن اپنے انقلابی کیفیتوں کے سبب ایک اہم دور تھا۔ جب انگریز پوری طرح دہلی و لکھنؤ پر قبضہ جما کر کوس لمن الملک الیوم بجا رہا تھا۔ مسلمان ایک طرف اس کے عتاب کا شکار تھے اور ہر لحاظ سے ان کو زندگی کی دوڑ میں پیچھے رکھا جا رہا تھا۔ ان کے مدارس بند کئے جا رہے تھے۔ اور مسلمان معاشی پریشانیوں میں گرفتار تھے۔ دوسری طرف ان ہی حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے کچھ دوسری قوتیں اُبھر رہی تھیں۔ جنہوں نے مسلمانوں کی زندگی کو بہتر بنانے اور ملک و قوم کی خدمت کرنے کو اپنا نصب العین قرار دے دیا تھا۔ اس گروہ کے سرخیل سرسید احمد خاں مرحوم تھے۔ جنہوں نے تہذیب الاخلاق کے اجرا سے اس کام کا بیڑا اُٹھایا تھا اور اس طرح ہندوستان کے ہر حصے میں ان کی آواز پہنچنی شروع ہو گئی۔ اس کے ساتھ سرسیّد کا پورے ہندوستان کا دورہ، سرسید کی آواز نے بہتوں کو (اس طرف) خدمتِ خلق کی طرف متوجہ کر دیا اکثر (رسالے) اخبار تو محض تہذیب الاخلاق یا سرسید کی مخالفت میں یا موافقت میں نکلنے شروع ہو گئے۔

زندہ دلانِ پنجاب نے سرسید کا استقبال جس جوش و خروش سے کیا اس کی نظیر تو ملنی ہی مشکل ہے۔ اس کا پتہ اس زمانے کے اس صحافتی ذخیرہ سے

ملتا ہے۔ جس کی اہمیت اپنی ادبی، سیاسی خدمات کے لحاظ سے کم نہیں۔ بلکہ اس امر کا بھی پتہ چلتا ہے کہ اُس زمانے کے حالات کے اعتبار سے کیسے کیسے جگر والے اہلِ قلم تھے۔ جنہوں نے حق گوئی کو اپنا پیشہ بنایا تھا۔ اُن کے اخبار محض پیسے کمانے کا ذریعہ نہ تھے بلکہ قوم کی رائے اور اس کا وقار صرف ان کے قلم کی جنبش سے متعلق ہوتا تھا۔ اسی لئے انہوں نے صحافت کو انتہائی ذمہ داری اور حق گوئی کے عہد کے ساتھ اختیار کیا۔

زیرِ نظر تبصرہ انیسویں صدی کے آخری قرن کے ایک مشہور ہفتہ وار اخبار رفیقِ ہند لاہور پر ہے۔ میں نے مولوی محرم علی صاحب چشتی مرحوم ایڈیٹر رفیقِ ہند کے فرزند نامور مولوی محمد ابراہیم صاحب بی۔اے، ایل۔ایل۔بی سے چند سوالات ان کے والد صاحب مرحوم کے اخبار کے سلسلہ میں دریافت کئے۔ موصوف نے جو جواب عنایت فرمائے وہ بجنسہ درج ذیل ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان سے بہتر کون ایڈیٹر رفیقِ ہند لاہور کے حالات پر روشنی ڈال سکتا ہے۔ اس لئے اخبار پر تبصرہ سے پہلے یہ خط پیش کیا جا رہا ہے۔

؎ موصوف ہی کے سبب مجھے رفیقِ ہند اخبار کے مطالعہ کا موقعہ ملا اور حالات بھی معلوم ہوئے۔ راقم اس سلسلہ میں ان کا از حد ممنون ہے۔

پیسہ اخبار سٹریٹ
لاہور
۲۷ر اکتوبر ۱۹۵۴ء

محبی

وعلیکم السلام

آپ کا مکتوب مورخہ ۲۲/۱۰/۵۴ء پیشِ نظر ہے۔ تعمیلِ ارشاد میں سوالات کے جوابات درج ذیل ہیں۔ فوٹوگرافر کے ساتھ آپ خود طے کرلیں اور بعد انتظام مجھے اطلاع دیں میں اُسے فوٹو اتارنے کا موقع بہم پہنچا دوں گا۔

خاکسار

محمد ابراہیم علی
چشتی

(۱) سوال:۔ پیدائش کس جگہ اور کب۔ کتنی عمر۔ کتنی اولادیں؟

جواب:۔ میرے دادا مولوی احمد بخش المتخلص بہ یکدل۔ عہد رنجیت سنگھ میں لاہور کی عربی و فارسی یونیورسٹی (دارالعلوم) کے ہیڈ تھے۔ جس کے لئے سکھ سلطنت کی جانب سے کئی گاؤں کی معافی حاصل تھی۔ اس مدرسہ میں سکھ دربار کے تمام اعلیٰ افسران اور درباری مثلاً لاہور کا مشہور فقیر خاندان اور دیوان بہادر راجہ نریندر ناتھ کا خاندان، اور رتن چند ڈاڑھی والا کا خاندان وغیرہ عربی فارسی کی تعلیم پاتے تھے کیونکہ سکھ دربار کی سرکاری زبان فارسی و عربی تھی۔ شاہ عالم ثانی شہنشاہ دہلی کی جانب سے انہیں فخر الشعراء یکدل آگاہ کا شاہی خطاب بھی ملا تھا۔ فارسی کے اعلیٰ پایہ کے شاعر تھے۔ میرے تایا یعنی مولوی احمد بخش صاحب کے سب سے بڑے لڑکے مولوی نور احمد چشتی جو انگریزی حکومت میں کئی مشہور انگریز خاندانوں مثلاً کولڈسٹریم خاندان کو اردو اور فارسی پڑھاتے رہے اور جنہوں نے سرکار انگریزی کے ایماء پر مشہور تاریخ لاہور "تحقیقات چشتی" لکھی۔ جو آجتک لاہور کے حالات میں مستند ترین کتاب سمجھی جاتی ہے اور ہائی کورٹ میں بھی پیش ہوتی ہے اور جس پر سید لطیف کی انگریزی تاریخ لاہور مبنی ہے۔ اس کے علاوہ یادگارِ چشتی کے نام سے ایک کتاب لاہور کے رسوم و رواج پر بھی لکھی جس کا اسی زمانے میں فرانسیسی میں بھی ترجمہ ہوا۔ اس کے علاوہ قریباً تیس کتابوں کے مصنف تھے۔ بتیس سال کی عمر میں وفات پائی۔

مولوی محرم علی چشتی، مولوی یکدل کے سب سے چھوٹی اولاد تھے۔ ۱۸۶۱ء کے عاشورہ محرم میں پیدا ہوئے۔ لاہور کے کوچہ چابک سواراں میں خاندانی حویلی

میں پیدائش ہوئی۔ ۱۹۳۱ء کے رمضان المبارک کی یکم تاریخ کو وفات پائی۔ اس طرح تقریباً ستر سال عمر ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ ۱۴ سال کی عمر میں پبلک لائف شروع کردی تھی۔ لہٰذا اکثر معاصرین کا خیال تھا (جو خلافِ واقعہ ہے) کہ عمر سو سال کے قریب ہوگی۔ دادا صاحب نے چار شادیاں کی تھیں۔ مولوی محرم علی آخری بیوی کی اولاد تھے۔ والد صاحب نے دو شادیاں کیں۔ پہلی شادی سے سات بچے ہوئے جو سب صغیر سنی میں فوت ہوگئے۔ صرف ایک لڑکا مولوی قائم علی چشتی جو بعد میں ریاست جموں و کشمیر میں پبلک پراسیکوٹر ہوئے اور ۱۹۴۱ء میں فوت ہوگئے۔ مولوی قائم علی چشتی کا لڑکا عثمان علی چشتی پہلے کشمیر سول سروس میں تھا اور اب پاکستان اکاؤنٹنٹ سروس میں (۱۹۵۴ء) سے داخل ہوئے۔ اس کے علاوہ مولوی قائم علی چشتی کی تین لڑکیاں ہیں۔

مولوی محرم علی چشتی کی دوسری شادی حضرت خواجہ مستان شاہ کابلی (وفات ۱۹۰۳ء) کی بڑی لڑکی سے ہوئی۔ خواجہ مستان شاہ افغانستان کے مشہور ولی اللہ تھے۔ امیر عبدالرحمٰن افغانستان اور سر سکندر حیات کے والد سردار محمد حیات خواجہ صاحب سے بیعت تھے۔ خواجہ صاحب کا فارسی دیوان آتشکدۂ وحدت افغانستان اور ایران کی ادبیات میں شمار ہوتا ہے۔ اور ان کی مشہور غزلیں مثلاً وہ جسکا مطلع ہے ؎ نیم کرشمہ ناز دہ نرگس نیم مست را

مست شراب غمزہ کن بادہ کش الست را۔

آجتک کابل اور ایران ریڈیو سے نشر ہوتی ہیں۔ خواجہ مستان شاہ سے مولوی محرم علی چشتی طریقت کی رو سے بیعت تھے اور ان کے سب سے بڑے خلیفہ بھی تھے

چنانچہ شجرۂ چشتیہ میں ان کا نام بطورِ مشائخ شامل ہے۔ اس دوسری شادی سے صرف ایک لڑکا راقم الحروف ابراہیم علی چشتی ہے۔

(۲) سوال:۔ خاندان باہر سے آیا تھا یا یہیں رہتا تھا؟

جواب:۔ خاندان حضرت عمر فاروق کی اولاد سے ہے۔ دیگر مورثان میں حضرت ابراہیم ادہم کا نام مشہور ہے۔ پنجاب میں بابا فرید شکر گنج جن کا مزار پاک پٹن میں ہے، ہمارے مورثِ اعلیٰ ہیں۔ لاہور میں قریباً چھ پشت سے قیام ہے ذکی دروازہ لاہور کا نام ہمارے جد پیر ذکی صاحب کے نام پر ہے جن کا مزار اس دروازہ کے عین ساتھ واقع ہے۔

(۳) سوال:۔ علمی مذاق۔ ذاتی رجحانات اور مذہبی رجحانات؟

جواب:۔ ابتدائی تعلیم خاندانی مدرسہ میں اپنے بڑے بھائی مولوی محمد علی سے پائی جو اعلیٰ درجہ کے اردو فارسی شاعر اور تاریخ گو تھے۔ مڈل نورمین کرسچین اسکول اندرون لاہور شہر سے پاس کیا۔ انٹرنس تک علی گڑھ ہائی اسکول میں پڑھا لیکن امتحان نہ دیا۔ اس کے علاوہ قانون میں پلیڈر کا امتحان پنجاب یونیورسٹی ۱۹۱۳ء میں پاس کیا۔ لیکن ذاتی مطالعہ سے انگریزی میں یہ دستگاہ تھی کہ بلا تکان تقریر و تحریر کا ملکہ تھا۔ اور بسا اوقات ہائیکورٹ کے ججوں کی زبان میں انگریزی غلطی پر حرف گیری کر لیتے تھے۔ اردو، فارسی، پنجابی میں ان کے ضخیم اشعار اور غزلیات وغیرہ موجود ہیں۔ زندگی کا سب سے بڑا رجحان تصوف تھا۔ رات کے دو بجے تک تصوف کی کتابیں قانونی کام سے فارغ ہونے کے بعد (آخر میں پنجاب ہائی کورٹ کے ایڈوکیٹ ہو گئے تھے) پڑھتے رہتے تھے۔ دن بھر جو کمائے تھے

رات کو جیب خیرات وغیرہ پر خالی کر کے سوتے تھے۔ ہندوستان کے تمام مزارات
پر عمارات بنواتے اور ختم کراتے تھے۔ ہر ماہ چاند کی چھٹی شریف خواجہ اجمیر اور
گیارھویں حضرت عبدالقادر بغدادی کا ختم منعقد کر کے مساکین کو کھانا کھلاتے تھے
اور طریقۂ چشتیہ کے مطابق سماع سنتے تھے۔ ہندوستان کے اکثر عرسوں میں شریک
ہوتے تھے۔ چنانچہ خواجہ اجمیری کا سہرا "دولہا ہے اجمیری خواجہ" اور پاک پٹن میں
گھڑا گھڑائی تقریب پر جو "پیاں پیاں چلو" کی نظمیں آج تک غسل اور عرس پر پڑھی
جاتی ہیں انہیں کی تصنیف ہیں۔ ذاتی عقائد میں حنفی سنت الجماعت طریقۂ چشتیہ
اور [illegible] لوی مکتبِ خیال سے متفق تھے۔ ملاقات اور خدمتِ خلق میں مشہور تھے
غیر مسلم اور سب فرقہ ہائے مسلم حتیٰ کہ خلیفہ قادیان کے خاندان سے بھی مراسم تھے۔
لیکن ذاتی عقیدہ و نبی میں سخت متشدد تھے اور انہوں سے کوئی خلافِ عقیدہ گفتگو
نہ سنتے تھے۔

اخبار نویسی کے دوران یہ کیفیت تھی کہ صبح شام پچاس ساٹھ آدمی دسترخوان
پر کھانا کھاتے تھے اور یتامیٰ و بیوگان کے وظائف مقرر تھے۔ لیکن طریقۂ تصوّف
کے عقائد کے مطابق روزانہ کی کمائی سے شام کو بچا کر رکھنا کفرِ طریقت سمجھتے تھے اور
مکان تعمیر کرنا خلافِ توکل۔ لہٰذا ہمیشہ کرایہ کے مکان میں رہے۔ چونکہ بیرونجات
سے چالیس پچاس مہمان ہمیشہ گھر میں رہتے تھے اس لئے مکان وسیع کرایہ پر لینا
پڑتا تھا۔ آخری مکان جس میں وفات ہوئی اُس زمانہ میں پونے چار سو روپے
ماہوار پر لے رکھا تھا اور اس میں اپنے خاندان کے علیحدہ زنانہ و مردانہ کے علاوہ
سو مہمان رہ سکتے تھے۔ دورانِ وکالت میں بعض مقدمات میں لاکھ اور ڈیڑھ

[illegible] بھی وصول کیا۔ لیکن چونکہ روزانہ کی کمائی شام کو ختم کر دیتے تھے اس
[illegible] اکثر مقروض بھی ہو جایا کرتے تھے۔ مثلاً ایک ہفتہ پانچ ہزار روپیہ
[illegible] بطور نذرانہ منی آرڈر کیا ہے اور اگلے ہفتے گھر کی اشیائے خوردنی
[illegible] ادھار آ رہی ہیں اور اس سے اگلے ہفتے سب قرضے ادا ہو کر پھر کئی ہزار
[illegible] خیرات میں تقسیم ہو رہا ہے۔

سوال: سیاسیات میں دلچسپی؟

جواب: [illegible]ء سے ۱۸۸۶ء تک سرسید کے اس مکتبِ خیال سے متفق
[illegible] مسلمانوں کو انگریزی حکومت سے بگاڑے بغیر جدید تعلیم حاصل کرنی چاہیئے۔
لیکن جب سرسید نے قرآن مجید کی تفسیر لکھتے ہوئے قدیم عقائد سے انحراف کیا
اور جب [illegible] تعلیم سے دینی نصاب خارج کرایا تو مسلمانوں کو جدید تعلیم سے زیادہ
[illegible] پر زور دینے لگے اور انجمن نعمانیہ ہند اور انجمن حزب الاحناف
[illegible] پنجاب کانگریس کے صدر بخشی جیتی رام تھے جو جسٹس
[illegible] کے والد تھے ان کے تعاون سے آل انڈیا کانگریس سے پیکٹ کیا
[illegible] مسلمان ارکان میں مسئلہ کو اپنا قومی مسئلہ قرار دیں اس پر باقی
[illegible] ۱۹۰۷ء میں جب تلک کی آمد پر گوکھلے
[illegible] تو والد بھی کانگریس سے علیحدہ ہو گئے۔ جسٹس امیر علی
[illegible] تعاون سے آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد قائم کی جس میں
[illegible] کا مطالبہ پیش کیا گیا۔ لیکن یہ جداگانہ مطالبہ تعلیم ملازمت
[illegible] محدود تھا اور آزادی کا نعرہ ابھی اختیار نہ کیا گیا تھا۔

(۶) سوال:- صحافت میں کب قدم رکھا؟

جواب:- سنہ ۱۸۸۴ء سے سنہ ۱۹۰۳ء تک مختلف وقفوں سے صحافت کی۔ اس کے بعد وکالت شروع کردی جو تادمِ مرگ جاری رہی۔ پروفیسر رچی رام ساہنی جو ان کے ہم جماعت اسکول میں تھے۔ ٹریبون اخبار میں لکھ چکے ہیں کہ اسکول میں بھی ایک پرچہ اخبار چھاپتے رہتے تھے۔

(۷) سوال:- اخبار کی اشاعت کتنی تھی؟

جواب:- شروع میں دو سو اور آخر میں قریباً دو ہزار۔ لیکن یہ تخمینہ ہے۔ مکمل رجسٹر کوئی موجود نہیں۔

(۸) سوال:- اخبار بند کیوں ہوجاتا تھا؟

جواب:- سنہ ۱۸۹۱-۹۲ء میں راجہ امر سنگھ کشمیر کا راجہ بن گیا تو اس کے پرائیویٹ سکریٹری کے طور پر ملازم ہوگئے تھے۔ سنہ ۱۸۹۲-۹۳ء میں کچھ پرچے نکلے تھے کہ بعض نجی اور کاروباری اسباب سے پرچہ بند ہوا اور پھر سنہ ۱۸۹۹ء میں چھ سال بعد جاری ہوا۔ ان دو بڑے وقفوں کے علاوہ سنہ ۱۸۸۴ء سے سنہ ۱۸۹۰ء تک اور پھر سنہ ۱۸۹۲ء کے اکتوبر سے لے کر سنہ ۱۹۰۳ء تک جبکہ اخبار ختم ہوا بالکل باقاعدہ نکلتا رہا۔ یہ ہفتہ وار اخبار سنہ ۱۸۷۵ء سے سنہ ۱۹۰۰ء تک لاہور سے مختلف ادوار میں نکلا۔ اس کی ضخامت سولہ صفحے کی اور اس کی تقطیع چوڑی ہوتی تھی۔

چندہ:- والیانِ ریاست سے ۵۰ روپے۔ ہندوستانی والیانِ ریاست سے ۳۰ روپے۔ رؤسائے عظام سے ۲۰ روپے۔ عام شائقین سے ۱۲ روپے۔ کم استطاعت طلباء سے چھ روپے چندہ مقرر تھا۔ قیمت سب سے پیشگی۔ محصول

کے لئے معاف تھا۔

ہر خبر کے ساتھ ایڈیٹر کا تبصرہ ضروری ہوتا تھا۔ باوجودیکہ اس زمانہ کی سیاسی کیفیات مسلمانوں کو پیسے چلی جارہی تھیں۔ حکومت کا جبر و استبداد ہر جگہ جاری تھا۔ لیکن ان پابندیوں کے باوجود یہ اخبار اپنی آزادانہ رائے، بے باک اظہار رائے میں کسی طرح سے دریغ نہیں کرتا تھا۔ اس اخبار میں کسی قسم کے اشتہار نہیں ہوتے تھے اور اخبار کی پالیسی بالکل واضح اور اپنی رائے کا اظہار بالکل صاف طور پر کیا جاتا تھا سیاسی نظریات کا خاص طور سے ذکر کیا جاتا تھا اور اس کا واضح مقصد مسلم قوم کے رجحانات کو پیش کرنا اور ان کے حقوق کا تحفظ تھا۔

اس اخبار کی طباعت کا پتھر کی چھپائی پر انحصار تھا۔ پلیٹ موجود نہ تھی۔ ہر اخبار اچھی، واضح کتابت کے ساتھ طبع کیا جاتا تھا۔ اور اردو زبان کو آسان اور واضح انداز میں پیش کیا جاتا تھا۔ اس کے باوجود بعض علمی اصطلاحیں خالصتاً عربی طرز پر ملتی ہیں مثلاً استصواب علمیہ۔ مقلل الحموق۔ تکلیفات وغیرہ۔

اس کے بعد ہر جنوری سنہ ۱۸۸۴ء کو نکلا۔ بڑی تقطیع۔ صفحات اسی طرح سولہ۔ دو کالم صفحہ پر ہوتے تھے۔ خاکی کاغذ استعمال کیا گیا۔ سر سید اور ان کے رفقاء پر تبصرہ ہر فروری سنہ ۱۸۸۴ء میں ملتا ہے اور کہیں کہیں مزاحیہ انداز بھی ہے۔ ہر خبر کے لئے ابتدائی الفاظ موٹے قلم سے۔ پھر ہر خبر کے متعلق تفصیل۔ اس اخبار میں بیرونی خبریں بذریعہ کارسپانڈنٹ موصول ہوتی ہیں اور ہر قسم کی خبریں ملتی ہیں۔ کابل، مصر اور یورپ کی خبریں۔ اس اخبار کے دوسرے نمبر (۱۲ جنوری سنہ ۱۸۸۴ء شنبہ) میں مہدی کذاب کی خبر اور اس کا مفصل تذکرہ ہے۔ اس کے بعد

اپنی رائے کا اظہار اس طرح کیا گیا ہے "ہماری رائے میں مہدیٔ کذاب کی حرکات
کو جس قدر جلد ممکن ہو، توجہ سے روکنا چاہیئے۔ اور قبل از وقت مدعی امامت کو مثل
صدہا باغیان سابق کے اپنے اعمال کی پاداش ملنی ضرور ہے۔ ؎

سرِ چشمہ شاید گرفتن بہ بیل — چو پُر شد نشاید گرفتن بہ پیل

ایک اور خاص خبر سید احمد خاں کا سفرِ پنجاب ہے۔ جس کا عنوان یہ ہے کہ۔
"سید صاحب نے ۲۰ر جنوری کی شام کو بذریعہ تار برقی خبر دی کہ بجائے ۲۱ر جنوری کے
۲۲ر جنوری کو علی گڑھ سے روانہ ہونگے۔ اس کا پہلا مقررہ پروگرام کالعدم سمجھنا چاہیئے
ہمیں معلوم ہوا ہے کہ جناب ممدوح کے سفرِ پنجاب میں ان کے ساتھ جناب حاجی
محمد اسمٰعیل صاحب رئیس دتاولی ضلع علی گڑھ، سید اقبال علی منصف گونڈہ ان
کے ایک عزیز سید محمد علی صاحب اور خدمتگار ہوں گے، لاہور میں سید صاحب
کے فروکش ہونے کا انتظام اسلامیہ ہوٹل میں ہوگا جس کو چند لائق اور اولوالعزم
مسلمانوں نے اپنے ہم مذہبوں کی آسائش کے لئے جاری کیا ہے اور جو ضروری
سامان اور لوازمات سے پوری طور سے آراستہ و پیراستہ ہے۔ یہ مکان ریلوے
اسٹیشن کے قریب ہے، شہر سے دور بھی نہیں۔ پس اگر سید صاحب کے فروکش ہونے
سے اس ہے۔ تو سید صاحب کو بھی اس میں چند روزہ رہائش سے افتخار
مقصود ہے۔ ایک صاحب تحریک فرماتے ہیں کہ سید صاحب کے احباب اور دیگر
قومی خیرخواہوں کو پوری سعی کرنی چاہیئے کہ کچھ روپیہ مدرستہ العلوم کے لئے جمع ہو جائے
چندہ ہی کے بہانے سے، دعوت ہی کے بہانے سے، نذر نیاز ہی کے بہانہ سے،
ایک روپیہ، دو روپیہ، چار آنہ، ایک آنہ، جو ملے ملنا چاہیئے۔ کیونکہ ان دنوں

کالج روپے میں روپے کی نیت ضرورت ہے۔ المختصر پنجاب کی مسلمان ریاستوں
سے اس معاملہ پر کامل توجہ کی امید ہے۔"

اس پرچے میں البرٹ بل کی شدید مخالفت ہے۔ گویا دو تین کالمی پورے
آرٹیکل اور مضمون میں جاتی تھیں۔ خبروں کے ساتھ ایڈیٹر کا تبصرہ ضروری ہوتا تھا۔
اس کے دو سبب ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہفتہ وار اخبار روزنامہ اور
ماہانہ پرچوں میں وسطی حیثیت رکھتا ہے۔ ایڈیٹر ہفتہ بھر کی خبروں کا انتخاب کر کے
اس میں سے منتخب خبروں پر پورا تبصرہ کرنا چاہتے تھے۔ دوسرے یہ کہ ہفتہ وار اخبار
کو صرف خبروں کا مجموعہ نہیں سمجھتے تھے بلکہ نقد و نظر کا مجموعہ بھی بنانا چاہتے تھے۔
بہر حال اس (البرٹ بل) کی مخالفت میں پورے دلائل صرف کئے گئے ہیں مثلاً
اسی بل کے سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں "ہم اس کو خوب جانتے ہیں کہ ہمارا تجربہ یقین
کے رتبہ کا ہے۔ بلکہ اس کو ہم ایک صداقت سمجھ کر پبلک اور گورنمنٹ دونوں کو
مطلع کئے دیتے ہیں خاص کر ایسے اضلاع میں جہاں انگریز زمیندار ہیں اور نیل
چائے، کافی وغیرہ کی اپنی کاشت رکھتے ہیں کہ ریل وغیرہ بڑے کارخانوں میں
نہایت قبیح جرم عمل میں آئیں اور سخت ظلم ہوگا۔ پہلے ہی ان لوگوں کی نگاہ میں
[illegible] (دیسی) جو کچھ جچتے ہیں، سب پر ظاہر ہے۔ پھر اس پر اُس وقت
کے جوانوں کے دلوں میں نئے غصے جو بھرے ہوئے ہیں۔ وہ ادنیٰ ادنیٰ باتوں پر
ان کے خون کے جوش میں دیا کریں گے۔ البرٹ بل کے پیش ہونے نے
ظاہر کر دیا ہے کہ وہ کس قدر قومی تنفر اور حقارت سے ہم کو دیکھتے ہیں۔ اور کب
برا ہم کو مانتے ہیں۔ بالتخصیص جب سے یہ بحث شروع۔ ان کے جذبات اور کینے

کہیں سے کہیں بڑھ چڑھ گئے ہیں۔ مرنیش کی مانند سب لوگ آگ بگولا بنے بیٹھے ہیں۔ ایسے مقامات پر بھی انصاف جیوری کے ہاتھ میں ہوگا۔ اور جیوری ان لوگوں کے ہاتھ میں ہوگی۔ جب ان کی عقلوں کا یہ حال ہے جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا، تو پھر قہر و غضب نہیں تو کیا ہے۔ بیس کروڑ مخلوق کی زبانیں ان خونخوار بھیڑیوں کے ہاتھ میں دیجاتی ہیں۔ ہماری یہ رائے اور اکثر ہمارے ہم وطن کی رائے بھی یہی ہے ہم کو لازم ہے کہ ایسی رائے کو ہرگز نہ چھپائیں، بلکہ پکار پکار کر کہہ دیں کہ ایسی صورت میں ایک Native اور یورپین کے باہم مقدمہ میں انصاف غیر ممکن ہے۔ یہی ہماری تمام ہمتوں کی بنیاد ہونی چاہیئے:

آگے چل کر لکھتے ہیں:۔ "کیا جس رعایا کے ساتھ ایسے مروّت بھرے وعدے کئے جاتے ہیں۔ ان وعدوں کا یہی نتیجہ ہونا چاہیئے کہ ہمارے قضا و قدر ہمارے مخالف بنائے جائیں؟ کیا باوجود مخالفت کے مینڈھوں کی قربانی کی طرح ایسے زبردست یورپینوں کے ہاتھ میں دینا (جن کے دامن میں وہ کانٹے کی طرح کھٹکتے ہیں) مقتضائے مروّت ہے ——

کیا غریب نیٹو قانون کے زیر سایہ رہنے کے لائق ہی نہیں۔ قانون لگان یا لوکل سیلف گورنمنٹ وغیرہ اس قدر فائدہ بخش نہیں جس قدر یہ جیوری کی مضر ہوگی۔"

سرسید کے آنے کے سلسلہ میں خبر شائع ہو چکی ہے اور خان بہادر برکت علی کی طرف سے پروگرام شائع ہو رہا ہے۔ اس پر تبصرہ ان الفاظ میں ہے۔ "خان بہادر برکت علی و سرسید میں اتنا ملاپ کہ وہ ان کے شریک کار رہے اور ان ہی کی جانب

سے پروگرام شائع ہو رہا ہے۔"

اس زمانے میں سرسید کی آمد اور ان کے پروگرام کی ایک خاص اہمیت تھی بلکہ لاہور اور امرتسر والوں میں مقابلہ ہوتا تھا کہ جو شہر آبادی کے لحاظ سے جو مرتبہ رکھتا ہو۔ اس لحاظ سے چندہ کی مقدار بھی زیادہ ہو۔

سرسید کی سلامتی عمر کی دعائیں مانگی جاتی تھیں وہ بھی اس طرح کہ خدا کی درگاہ میں ایک میموریل بھیجا گیا۔ "بحضور خداوند عالم عالمیاں، کہ اگر کوئی ایسا ٹھیک حساب مقرر ہو کہ باشندگانِ عالم کی مجموعی تعداد میں ضرور بحساب اوسط کچھ سال کم کر دیئے جائیں تو بڑی خوشی سے اپنی ناچیز عمروں کی تعداد میں سے فی کس کم از کم ایک دن اس کی زیادہ عمر کی خاطر دینے کے لئے تیار ہیں۔ اس حساب سے پچیس کروڑ دنوں کے جمع ہونے سے صدہا سال اُس ایک مرد کی عمر میں زیادہ ہو سکتے ہیں۔"

۲؍ فروری ۱۸۸۴ء کے اخبار سے معلوم ہوتا ہے کہ سرسید کا استقبال کس طرح ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب رفیقِ ہند میں سرسید کے پروگرام، ان کے سفر، نیز لوگوں کی میزبانیوں کو مفصل شائع کرتے تھے۔ اسی کے ساتھ ہی سرسید کا زوردار لیکچر، لوگوں کے سپاس نامہ اور سرسید کے جوابات مفصل درج ہوتے تھے۔ غرض یہ اخبار سرسید کے مشن کو کامیاب بنانے میں ایک اہم فرض سرانجام دے رہا تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سرسید گویا ایک خدائی آواز ہے جو جگہ جگہ لوگوں کو بیدار کرنے کی فکر میں ہے۔

اسی پرچہ میں صـ۱ پر سرسید کا قلمی چہرہ ملاحظہ فرمایئے۔

"خود سید صاحب بفضلِ الٰہی ایک بھاری بھرکم موٹے اور تنومند بزرگ ہیں۔ گو کہ بہت سے سالوں کی وجہ سے دبی ہوئی معلوم ہوتی ہے مگر پھر بھی اسے بہت خمیدہ

نہیں ہونے دیتے۔ پرہیزگاری اور باقاعدہ عادات نے ان کا کانسٹیٹیوشن بہت عمدہ رکھا ہے۔

اس کے علاوہ بعض دوسرے لوگوں کے بھی قلمی چہرے ہیں۔ مثلاً مولوی سید محمد اسمٰعیل صاحب رئیس دتاولی ضلع علی گڑھ کا قلمی چہرہ بھی ملاحظہ کیجیے۔

"ایک متوسط قد کے دیدار جوان ہیں۔ عربی پوشاک پہنتے ہیں۔ سچ مچ اُس خطۂ پاک کے باشندے معلوم ہوتے ہیں۔ بہت متشرع، متقی، ہنس مکھ اور خلیق بزرگ ہیں۔"

سرسید کے ساتھ ایک اور صاحب مولوی اقبال علی صاحب مصنف فیض آباد کے متعلق چند فقرے قابل ملاحظہ ہیں: "کامل جنٹلمین ٹھیک ترکی لباس پہنتے ہیں۔ ڈاڑھی پوری چٹ رہتی ہے۔ ہرچہ گیرید مختصر گیرید۔ متوسط قد کے آدمی ہیں۔ چہرہ سے ذہانت برستی ہے۔ سید صاحب کے رفقا میں بہت مشہور ہیں۔ گویا جناب ممدوح کے سیکرٹری اعظم ہیں۔ ایک کمال جو آپ میں پایا جاتا ہے وہ خاص طور پر ذکر کرنے کے قابل ہے۔ یعنی جب ایسے زود رقم ہیں کہ ہر ایک مقام کے، ہر ایک جلسہ کی تقریروں کو فی الفور ساتھ ساتھ قلمبند کرتے جاتے ہیں۔ دیکھا گیا تو بلفظہٖ قلم کے ایک عجب نا ٹک سے ایسا شعبدہ دکھلاتے ہیں جو بلاشبہ قابلِ تقلید ہے۔ کسی قدر لطیفہ گوئی بھی آپ کی عادت میں ہے۔ انگریزی سے بھی واقف ہیں۔"

اسی نمبر میں سرسید کے لیکچر کا اقتباس دیا گیا ہے۔

۳۰ جنوری ۱۸۸۴ء کو سرسید امرتسر سے واپس ہو کر لاہور پہنچے، ۵ بجے شام کو سرسید کا شاہانہ استقبال ہوا۔ نواب عبدالمجید خاں، منشی بشیر علی اور زبدۃ الحکما غلام نبی صاحب

ساتھ تھے۔ سرسید نے مہاراجہ کپور تھلا کی کوٹھی میں قیام کیا۔

۹ فروری ۱۸۸۴ء کے پرچہ میں ڈیوک آف مجیٹھ اور اہلِ اسلام کے عنوان سے یوں تذکرہ ہے۔

"آنریبل سید کے سفرِ پنجاب کا تذکرہ کرتے ہوئے اگر ہم عالی جناب ڈیوک آف مجیٹھ سردار دیال سنگھ، رئیس اعظم کی اس دلی محبت کے ذکر سے آنکھیں بند کرلیں جو انہوں نے اپنے پست، بے ہمت اور درماندہ مسلمان بھائیوں سے ظاہر کی ہے تو شاید یہ ایک بڑی حق تلفی ہوگی۔ ڈیوک ممدوح آج سے نہیں بلکہ ایک عرصہ دراز سے اپنے مفلوک الحال بھائیوں کی غمخواری پر متوجہ ہیں، سوائے دوسرے کارناموں کے وہ پہلے بھی دو تین مرتبہ بڑے بڑے معقول چندوں سے مدرستہ العلوم کو مدد دے چکے ہیں۔ اس مرتبہ بھی انہوں نے جیب خاص سے پانچ سو روپیہ مرحمت فرمایا۔"

اس طرح کے تبصروں سے اس اخبار کی بے لاگ، صاف اور کھری باتوں اور اخبار کی سچی پالیسی کا پتہ چلتا تھا۔ وہ جب کسی کے اچھے کاموں سے متاثر ہوتے تھے تو اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔

ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ اس اخبار میں جب انہوں نے انگریزی الفاظ استعمال کرنا شروع کیے تو لوگوں کی طرف سے اعتراضات کی بھرمار ہوئی۔ مراسلات میں مختلف الخیال لوگوں نے حصہ لینا شروع کیا۔ بعض نے انشا کے اشعار کو بطور سند پیش کرنا شروع کیا ؎

حاضری کھائی جو لندن میں تو لیٹن میں ٹفن

یا کسی دوسرے شاعر کا مصرع ؏ برق بنگالہ ظلمت میں گورنر جنرل۔

اس تاریخ کے پرچہ میں ایک کالمی عنوان ہے "گورنمنٹ بنگال اور وہاں کے دیسی اخبارات"

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ بتایا گیا تھا کہ مسٹر ٹامسن (حال لیفٹیننٹ گورنر) نے اس بات کی شکایت کی کہ دیسی اخبارات بہت سختی سے گورنمنٹ کے خلاف لکھتے ہیں اور جھوٹی خبریں سرکاری عہدہ داروں کے خلاف اور گورنمنٹ کے خلاف شائع کرتے ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ رفیقِ ہند کی پالیسی نہایت واضح تھی، جب یورپین حکام دورے کرتے تھے تو غریبوں کو بطور بیگار پکڑنا ایک عام بات تھی۔ اس اخبار نے اس بری رسم کے خلاف واضح طور پر احتجاج کیا۔ اور یورپین حکام پر تنقید کی۔ اتنی کھلی تنقید رفیقِ ہند کی پالیسی تھی اور اس زمانے میں اس اخبار نے رائے عامہ کو بیدار کرنے اور انگریز حکام کے ظلم و ستم کو بغیر کسی پرواہ کے ظاہر کرنے میں دریغ نہیں کیا۔

دہلی اور لکھنؤ کے زباندانی کے قضیے

معلوم ہوتا ہے کہ دہلی و لکھنؤ کے لوگوں میں جو شرف افتخار ہونے کا خیال جاگزیں ہو گیا تھا اس نے ایک خاص اثر دوسروں پر ڈالا تھا، جیسا کہ رفیقِ ہند میں ہے۔

۱۵ اپریل ۱۸۸۴ء۔ "چند حضرات کے دماغ میں یہ خبط سمایا ہے کہ اردو کی زباندانی اس شخص کے باپ دادا، پوتے پڑپوتے کا حق حاصل ہے جس کو حدود دہلی کے اندر پیدا ہونے کا افتخار حاصل ہوا ہو۔ اس قسم کے جاہل مسخرے دہلی کے علاوہ سب شہروں کے رہنے والوں کو پنجابی براہِ حقارت کہہ کر پکارتے ہیں مگر نہ معلوم اپنے آپ کو کسی چینی یا روسی نسل سے جانتے ہیں یا کسی اور حصۂ زمین کا باشندہ سمجھتے ہیں۔ دہلی

خود پنجاب میں ہے۔ سوائے اس کے کہ کوئی شخص کسی اور بے تحقیق دیار کا رہنے والا ہو، دوسروں کی نسبت پنجابی شریف براہ حقارت استعمال کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ بے شک چونکہ دہلی اور لکھنؤ میں زیادہ تر اس زبان کی پرورش ہوئی اس لئے کچھ نہ کچھ ترجیح وہاں کے باشندوں کو بوجہ ان کی محبت اور سابقہ حقوق کے دینی چاہئے۔ مگر نہ یہاں تک کہ حدِ اعتدال ہی سے گزر جائے کیونکہ ان شہروں میں تو زبان بھی وہی فصیح سمجھے جانے کے قابل ہے جو شرفا کی سوسائٹیوں میں مروج ہے۔ نہ ان لوگوں کے چلن نے قدرتی طور پر شرفا کی محبت سے انھیں خارج رکھا ہو۔ کیا یہ نالائق لوگ اس بات کو زباندانی سمجھتے ہیں کہ کسبیوں کی سی نوک جھونک اور چوٹیں اور رنڈیوں کے سے طعنے مہنے استعمال کئے جائیں۔ کیا یہ شہدہ مزاج لوگ صرف بیہودہ لفظی باتوں میں اخباروں کے کالم کے کالم سیاہ کر دینے اور شیطان کی آنت فقرات لکھ مارنے جن کا سر ہے نہ پیر۔ مبتدا ہو نہ خبر، اس کو زباندانی جانتے ہیں۔ اگر یہی بات ہے تو ع برین عقل و دانش بباید گریست۔

رفیقِ ہند کی پالیسی دیسی ریاستوں کی نسبت

رفیقِ ہند دیسی ریاستوں کے قیام کا سب سے بڑا حامی و معاون ہے۔ وہ کسی حالت میں بھی ان کے ذرا سے ضعف کو گوارا نہیں کرتا۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ یہ ہماری قومی آثار الصنادید کے علاوہ ہماری قدیم حکومتوں کے کھنڈرات ہونے کے ہماری عادل گورنمنٹ کے ایک بڑے مضبوط اور قابلِ اعتماد دست و بازو ہیں۔ لیکن وہ اپنے پراسپکٹس کے وعدے کے مطابق کمال ادب سے اور کمال نیاز مندی سے ان کے انتظامی امور میں مدد دینا ایک بہت بڑا اہم فرض جانتا ہے

وہ ہرگز ایسی بات کو گوارا نہیں کر سکتا کہ صرف اپنے ہم وطن ایک شخص کی حمایت کے
جوش میں ان اپنے لکھوکھا ہم وطنوں کے حقوق کو نظر انداز کر دے جو اس کے زیر سایہ
زندگی بسر کرتے ہوں۔ وہ اس کو ایک بڑی قوم دشمنی اور بے ایمانی سمجھتا ہے۔ اس کی
حمیت اور اس کی قومی ہمدردی کا جوش اس بات کو گوارا نہیں کر سکتا۔ لیکن ہمیں ان
اینگلو انڈین اخبارات سے متفق سمجھنا جو دیسی ریاستوں کے خلاف لکھنے پر ادھار
کھائے بیٹھے ہیں اور ہمیشہ بات کا بتنگڑ بنا کر گورنمنٹ کو بدظن کیا چاہتے ہیں سخت
حماقت اور پرلے درجہ کی بیوقوفی ہے۔"

ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ رفیق ہند اپنے لئے ایسی ذلیل زندگی کے مقابل موت
کو زندگی سمجھتا ہے۔ ہم پبلک کو اپنا آقا سمجھتے اور جانتے ہیں کہ اگر ہم فی الحقیقت ایک
نیک کام کر رہے ہیں تو بالضرور پبلک کو اپنے سچے خادم کی کامیابی کا خیال ہے۔

اس اخبار میں اخبارات کی آزادی کے سلسلے میں بڑی جرأت سے کام لیا ہے
اور اپنے اخبار میں ایسے آرٹیکل لکھے جن میں ولایت میں اخبارات کی آزادی کا ذکر
تھا۔ مثلاً یونائیٹڈ آئرلینڈ نامی ایک آئرلینڈ کے اخبار میں مہدیٔ قزاق کی
نسبت ایک آرٹیکل لکھا گیا تھا۔ رفیق ہند نے اس آرٹیکل کے الفاظ نقل کئے ہیں
جس میں یہ لکھا تھا "ہم یہ چاہتے ہیں کہ دوسرے پرچے میں ہمیں یہ تازہ خبر چھاپنے کا
موقع ملے کہ جنرل گارڈن کو بھی وہی عزت نصیب ہوئی جو...... بادشاہ
کے حصہ میں آئی تھی۔ ہمارے لئے اس سے زیادہ جوش دینے والا کوئی امر نہیں
کہ ہم سوڈان میں مہدی کی کامل فتحیابی اور قاہرہ کی دیواروں تک پہنچ جانے کی
خبر چھاپیں۔ ہر ایک پارلیمانی یورپین شخص کی یہ خواہش ہے کہ انگریزوں کی اس بے ایمانی

کی جنگ کے سلسلے میں کوئی زبردست قدرتی تھپیڑ خدا کی طرف سے ان کو لگے۔"
۴ر فروری ۸۴ء کو پارلیمنٹ کے ایک ممبر نے وزیر اعظم کو ان باخیاذ الفاظ
کی طرف توجہ دلائی۔ لیکن گلیڈ اسٹون نے کہا "ہمیں کوئی اختیار اس آرٹیکل
کے خلاف قانونی کارروائی کرنے کا نہیں ہے۔ اور آزادیٔ رائے کے خلاف
عملدرآمد کرنا پبلک کو آزادی کے ساتھ نکتہ چینی کے استحقاق سے محروم رکھنا ہے۔
ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ جس بات کو وہ درست سمجھے اسے آزادی کے ساتھ اعلانیہ
کہہ دے، گو اس میں شک نہیں کہ جو عقلمند اور باانصاف شخص اس آرٹیکل کو پڑھیگا
وہ اسے بڑے افسوس اور غصہ کی نگاہ سے دیکھے گا۔"

اب طرفہ ماجرا سنئے کہ اس اخبار زیر بحث کے ایڈیٹر جو آئرلینڈ کے باشندے
ہیں وہ بھی پارلیمنٹ کے ممبر ہیں اور وہ بھی یہاں تشریف رکھتے ہیں۔ مسٹر گلیڈ اسٹون
کے بیٹھ جانے کے بعد آپ کھڑے ہوئے اور فرمایا۔ اس امر کا تو مجھے بھی افسوس
ہے کہ جنرل گارڈن کی نسبت ایسا لکھا گیا۔ کیونکہ وہ آئرلینڈ والوں کے دوست
ہیں لیکن باقی جو کچھ اس آرٹیکل میں لکھا گیا ہے بالکل صحیح اور بالکل درست ہے،
اور جو اولوالعزم شخص انگریزوں کے ظلم کا بہادری سے مقابلہ کرے، اس کی نسبت
جو کچھ ہمدردی آئرلینڈ کے باشندوں کو ہے اس کا عشر عشیر بھی اس آرٹیکل سے
ظاہر نہیں ہوتا اور بس۔"

اس بات کا سننا تھا کہ پارلیمنٹ کے آئرش ممبروں کی طرف سے بڑے جوش
کے ساتھ نعرہ مرحبا بلند ہوا۔

(گویا رفیق ہند نے بالواسطہ طور پر ایک طرف انگریزوں کے ظلم و ستم کو ہندوستانیوں

پر دانع کیا اور دوسری طرف اخبارات کی آزادیٔ رائے کی اہمیت کو برقرار رکھنے اور شعورِ عامہ کو بیدار کرنے میں بڑا حصہ لیا۔ انیسویں صدی کا آخر وہ شدید زمانہ تھا جہاں اخبارات کے لئے یہ تصور کرنا بھی محال تھا کہ وہ حکومتِ وقت کی پالیسیوں پر اس انداز سے تبصرہ کریں گے جس سے خود حکومت کے خلاف باغیانہ خیالات پیدا ہونے کے امکان ہیں)

۱۹ مارچ ۱۸۸۵ء کے پرچے میں عالمی سیاست کے سلسلے میں رفیقِ ہند نے تبصرہ کیا اور اس تبصرہ کا عنوان تھا "ہمارا ایشیائی رقیب" روس نے مرو پر قبضہ کر لیا تو ایک تہلکہ مچ گیا۔ لیکن مسٹر گلیڈ اسٹون نے انگلیسی اور ایشیائی معاملات کے سلسلے میں روس کا ہندوستان پر حملہ کرنے کے خوف کو بالکل "بڑھیا عورتوں کا خوف ہے" کے الفاظ ادا کئے۔ اس پر رفیقِ ہند نے جو تبصرہ لکھا۔ اس کے الفاظ حسبِ ذیل ہیں۔ "بدقسمتی سے واقعات و حالات اس قسم کے ظاہر ہوئے ہیں اور ہوتے جا رہے ہیں کہ ہمارے دیرینہ سال اور صد ہا باراں دیدہ یاروں کے اصول دستورِ معظم کی فاش غلطی پر دلالت کرتے ہیں۔ روس ایک ایسی دزدیدہ چال سے وسط ایشیا میں ترقی کر رہا ہے جب ان چند گزشتہ سالوں کی ترقی پر خیال دوڑایا جائے تو عجیب حیرت انگیز اور خوفناک خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ ابھی ہم نے سنا کہ مرو پر بھی روس کا تسلط ہو گیا۔ یہ وہی مقام ہے جس کی نسبت شاہزادہ ـــــ کو انگریزی گورنمنٹ کی طرف سے لکھ دیا گیا تھا کہ "اگر اس مقام پر روس نے ذرا بھی پیش قدمی کی تو انگریز اس کو ایک بڑا سنگین حادثہ سمجھیں گے۔ اور باہمی تعلقات میں بہت ہی خلل پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔"

[illegible] انیسویں صدی کے آخر میں رفیق ہند نے اہل ہند
جائز مطالبات منوانے اور ان کے حقوق کے تحفظ کے
نہایت ہی جرأت مندانہ انداز میں جد و جہد کی۔
[illegible]س اخبار نے مختلف ادوار میں نہایت بے باکی کے
[illegible] واقعات حاضرہ پر بے لاگ تبصرہ کئے۔ اس نے نہ
[illegible]ف صحافت کا معیار بلند کیا، بلکہ آئندہ دور کے
[illegible] افیون کے لئے بھی ایک واضح لائحہ عمل پیش کیا،
[illegible]ت، سادہ اور دلکش انداز تحریر سے عوام میں بیداری
[illegible] کرنے میں حصہ لیا۔

[illegible]ولوی رفیق علی چشتی صاحب نے اخبار نویسی ہی کو
[illegible] معاش نہیں بنایا۔ بلکہ اس اخبار کے ذریعہ
[illegible]سروں کو با عزت اور ہنرمند طریقہ سے زندگی بسر کرنا
[illegible]ایا۔ انھوں نے صحافتی انداز فکر سے اردو ادب کی
[illegible] میں اہم ترین حصہ لیا۔ اسی لئے جب کبھی
[illegible]حافتی ادب کی تاریخ لکھی جائیگی تو مورخ کو
[illegible] ہند کی پرخلوص اہمیت کا تذکرہ کئے بغیر کوئی
[illegible]ہ کار نہیں رہیگا۔